ذکر جامی

ترجمان مصلح الامتؒ حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب جامیؒ کے حالات زندگی

مؤلف

مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی

صدر المدرسین مدرسہ شیخ الاسلام، شیخوپور، اعظم گڑھ یوپی

ذکرِ جامی

ترجمانِ مصلح الامت حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامؔی کے حالاتِ زندگی

مولف

حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی

(صدر المدرسین مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور، اعظم گڈھ یوپی)

ناشر

مولانا محی الدین جامؔی

644/A، وصی آباد، نور اللہ روڈ، الہ آباد (یوپی)

تفصیلات

نام کتاب : ذکرِ جامی
مؤلف : مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی
باہتمام : مولانا ضیاء الحق خیرآبادی
صفحات : 216
طبع اول : ۱۹۹۴ء
طبع دوم : جولائی ۲۰۰۹ء
ناشر : مولانا محی الدین جامی
قیمت : 90/=
ای میل: **zeyaulhaquekbd@gmail.com**

ملنے کے پتے

☆ مکتبہ ضیاء الکتب، خیرآباد، ضلع مئو یوپی 9235327576
☆ فرید بک ڈپو پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲
☆ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند
☆ مکتبہ الفہیم صدر چوک مئوناتھ بھنجن 9236761926

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

تعارف طبع دوم	-----------------------------	۷
ہمارے بھائی جی	مفتی عبد القدوس صاحب رومیؔ	۸
ارشادات	مولانا محمد قمر الزماں صاحب الہ آبادی	۲۱
تأثر	مولانا نفیس اکبر صاحب، ہتھورا، باندہ	۲۳

☆☆☆☆☆☆☆☆

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
	باب: ۱ تمہید وتعارف	۲۴
	باب: ۲ نام و نسب اور وطن	۳۰
	مورث اعلیٰ	۳۰
	صوبہ میاں	۳۲
	مولوی داداؒ	۳۲
	مولوی فضل حق صاحبؒ	۳۴
	مولانا سراج الحق صاحب مچھلی شہریؒ	۳۴
	باب: ۳ مولانا عبد الرحمن جامی	۴۱
	ولادت	۴۱
	تعلیم، اسکول سے مدرسہ	۴۱
	عربی تعلیم	۴۴

	ایک خاص رنگ	۴۴
	حضرت تھانویؒ کی خدمت میں ایک عریضہ	۴۵
	باب : ٤ مظاھر علوم میں	۴۸
	دوبارہ سہارن پور میں	۵۵
	مولانا اسعد اللہ صاحبؒ سے ملاقات	۵۵
	باب:۵ بارگاہ تھانوی میں	۵۷
	باب:٦ فراغت اور تدریس	٦۹
	مدرسہ اسلامیہ فتح پور میں	۷۱
	باب: ۷ بیعت واصلاح نفس	۷۵
	باب:۸ بارگاہ مصلح الامت میں (۱)	۸۱
	تحریر ملفوظات	۸۳
	باب:۹ بارگاہ مصلح الامت میں (۲)	۸۸
	’’معرفت حق‘‘ اور ’’وصیۃ العرفان‘‘	۹۰
	تالیفات مصلح الامت	۹۱
	جامیؔ صاحب بحیثیت مدرس	۹۲
	جامیؔ صاحب بحیثیت مفتی	۹۲
	شیخ ومرید کے درمیان واسطہ	۹۳
	باب:۱۰ سفر حج اور حضرت کا وصال	۹۵
	سیّد علوی مالکی سے ملاقات	۱۰۲
	رمضان المبارک کا ایک منظر	۱۰۳

مدینہ طیبہ میں ۱۰۳
غارِ حرا کی زیارت ۱۰۷
باب: ١١ یادِ شیخ ۱۱۳
باب: ١٢ چند قابل ذکر باتیں ۱۱۹
تواضع وخاکساری ۱۲۱
صبر و شکر ۱۲۳
باب: ۱۳ لطائف جامی ۱۲۵
’’غیر مبین‘‘ کے بس کی بات نہیں ۱۲۵
اسی لئے کان پکڑتے ہیں ۱۲۶
چٹ آئی پٹ بجھی ۱۲۷
کون لڑ کے گیا ۱۲۷
رأیت ۱۲۸
میں نے کہا جا پانی لا ۱۲۸
کل کیوں آج صدر مدرس ۱۲۹
سبعة وثامنهم کلبهم ۱۲۹
باب: ١٤ تالیفات ۱۳۱
ترصیع الجواہر المکیۃ ۱۳۱
اُسوۃ الصالحین ۱۳۲
ترغیب الفقراء والملوک ۱۳۴
بیاض خاص ۱۳۵

	حالات مصلح الامت	۱۳۶
	تنویر السالکین	۱۳۸
	باب :۱۵ وفات اور اولاد	۱۴۲
	اولاد	۱۴۴
	ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں	۱۴۶
	مکتوب حضرت قاری صاحب مدظلہٗ	۱۵۴
	مکتوب تعزیت (حضرت مولانا ابرار الحق صاحبؒ)	۱۶۰
	کافیۂ حضرت مصلح الامۃؒ کے شارح (مولانا رومی صاحب)	۱۶۲
	استاذ گرامی مولانا عبد الرحمٰن جامیؔ (مولانا ظفر احمد صدیقی)	۱۷۰
	مولانا عبد الرحمٰن جامیؔ (مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ)	۱۷۶
	ضمیمہ	۱۷۸
	اخلاص کی تعریف	۱۷۸
	دولت خانہ اور غریب خانہ	۱۸۰
	حضرت مولانا شاہ محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادیؒ	۱۸۲
	انیس بھائی مرحوم	۱۹۰
	داروغہ جی (مشتاق احمد)	۱۹۷
	تقریر عید الفطر	۲۰۳
	تقریر عید الاضحیٰ	۲۰۹
	تقریر مسلم لڑکیاں اور موجودہ دنیوی تعلیم	۲۱۱

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تعارف طبع دوم

یہ ’’ذکر جامی‘‘ کا دوسرا ایڈیشن ہے، جو صاحب سوانح کے صاحبزادے مولانا محی الدین جامیؔ کے زیر اہتمام شائع ہورہا ہے، پہلا ایڈیشن بھی انھیں کی توجہ وعنایت سے ۱۵؍سال پہلے شائع ہوا تھا، اور اب کمیاب ہے۔

اس اشاعت میں کئی مضامین کا اضافہ ہے۔

(۱) ’’مولانا عبدالرحمٰن جامیؔ‘‘ مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ
(۲) ’’استاذ گرامی‘‘ مولانا ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی
(۳) ’’کافیۂ حضرت مصلح الامۃ کے شارح مولانا عبدالرحمٰن جامی‘‘
بقلم: مولانا مفتی عبدالقدوس صاحب رومیؔ
(۴) مولانا عبدالرحمٰن جامیؔ کی تین تقریریں دستیاب ہوگئی تھیں، انھیں شامل کتاب کردیا گیا۔

اللہ تعالیٰ مولانا محی الدین صاحب جامیؔ کی مساعی کو مشکور کرے، اور سابقہ ایڈیشن کی طرح اس کو بھی قبول عام سے نوازے۔ **آمین یارب العالمین**

* * * * *

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہمارے بھائی جی

حضرت مولانا مفتی عبدالقدوس رومیؔ دامت برکاتہم، مفتی شہر آگرہ

نہ صرف راقم السطور ہی اپنے برادر محترم مولانا عبدالرحمٰن جامیؔ علیہ الرحمہ کو ''بھائی جی'' کہتا تھا بلکہ سب ہی بھائی بہن انھیں بھائی جی ہی کہتے تھے۔

''حالات مصلح الامت'' (غریق بحر رحمت قدس اللہ سرہٗ) کو جلد اول (حصہ اول دوم) کی اشاعت کے وقت برادر محترم جناب عبدالوکیل صاحب کاظمی زیدمجدہم نے فرمائش کی کہ مرتب حالات سے متعلق مختصر طور پر ایک تعارفی مضمون احقر بھی لکھ دے، ساتھ ہی یہ تاکید بھی تھی کہ مضمون مختصر ہونا چاہئے، اس وقت ان کی تعمیل فرمائش میں ایک مختصر ہی تحریر لکھ دی گئی تھی، جو ''حالات مصلح الامت'' کی جلد اول کے شروع میں ''کافیۂ حضرت مصلح الامتؒ کے شارح مولانا عبدالرحمٰن جامیؔ'' کے عنوان سے شائع ہوگئی ہے۔

اس مختصر تحریر کو پڑھ کر بعض احباب نے اس کے اختصار کی شکایت کی، کہ اتنی مختصر تحریر مولانا جامیؒ کے تعارف کے لئے کافی نہ تھی، میں نے اپنی مجبوری ظاہر کردی کہ اس کتاب میں گنجائش ہی اتنی تھی، اس لئے زیادہ کیسے لکھتا، اور یہ بھی بتادیا کہ برادر محترم مولانا عبدالرحمٰن جامیؔ مرحوم ومغفور سے متعلق ایک مستقل اور مفصل تذکرہ محبّ مکرم مولانا اعجاز احمد اعظمی زیدمجدہم لکھ رہے ہیں، جو خود حضرت مصلح الامت علیہ الرحمہ کا

قابل قدر تذکرہ لکھ چکے ہیں اس لئے بہتر یہی ہوگا کہ جس قلم نے مرشد عصر غریق بحر رحمت حضرت مصلح الامتؒ کا تذکرہ لکھا ہے وہی ان کے مسترشد خاص وجویائے گمنامی مولانا عبدالرحمٰن جامیؔ کا بھی تذکرہ لکھے۔

چنانچہ یہی ہوا کہ فاضل گرامی مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی نے زیرنظر تذکرہ اپنے طرزِ خاص میں مرتب کردیا، اور حق یہ ہے کہ حق ادا کردیا ہے۔

برادر محترم مولانا جامیؔ صاحب علیہ الرحمہ کے خاندانی اور ابتدائی حالات سے متعلق معلومات راقم السطور ہی سے حاصل کی تھیں، اور کچھ باتیں اُنھیں برادر محترم کے خطوط سے حاصل ہوگئی تھیں جو بھائی صاحب محفوظ چھوڑ گئے تھے۔

مولانا اعجاز احمد صاحب کا تذکرہ جب کتابت کے مرحلے سے گذر چکا تو اسے دیکھنے کی نوبت آئی، دوران مطالعہ کہیں کہیں ضرورت محسوس ہوئی کہ بات اپنی صحیح صورت میں سامنے نہیں آسکی ہے یا کچھ زیادہ مختصر ہوگئی ہے، جس کی کچھ تفصیل ہوجائے تو بہتر ہو۔

اسی خیال سے بطور تذئیل وتکمیل یہ مختصر یادداشت بھی شامل تذکرہ کی جارہی ہے۔

(۱) دوسرے باب میں نام ونسب اور وطن کا ذکر کیا گیا ہے، جس کی مزید کچھ تفصیل یہاں ذکر کی جاتی ہے۔

جونپور میں جو ہمارے مورثِ اعلیٰ آئے تھے وہ مخدوم قاضی عیسیٰ سیستانی تھے، یہ بزرگ حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ سے بیعت اور ہر چہار سلسلہ میں ان سے خلافت واجازت رکھتے تھے۔ ۸۰۱ھ میں جب دہلی پر تیمور کا حملہ ہوا اور دہلی کا قیام دشوار ہوگیا تو قاضی عیسیٰ بھی بہت سے دوسرے مشاہیر کی طرح اپنے اہل وعیال کے ساتھ جونپور آگئے جہاں ابراہیم شاہ شرقی نے انھیں قاضی کے عہدہ پر مقرر کردیا۔ ان کے ساتھ ان

کے دونوں فرزند محمد و احمد بھی تھے، ہم لوگ بڑے صاحبزادے مخدوم محمد بن قاضی محمد عیسیٰ علیہ الرحمہ کی نسل سے ہیں۔ مورث اعلیٰ تک پورا شجرۂ نسب اس طرح ہے:

(۱) عبدالرحمٰن جامی (۲) ابن محمد سراج الحق (۳) بن فضل حق (۴) بن عبد الحق (۵) بن غلام مصطفیٰ (۶) بن غلام مرتضیٰ (مولف بیاض خاندانی نسب نامۂ صدیقیاں) (۷) بن غلام میر (۸) بن محمد شاہ (۹) بن شیخ احمد (۱۰) بن عبدالصمد (۱۱) بن عبدالقدوس (۱۲) بن عبدالرحیم (۱۳) بن بندگی بڑے شیخ (۱۴) بن بندگی خواجہ کلاں (دفین جھونسی ؁۱۰۰۴ھ) (۱۵) بن بندگی نصیر الدین محمد شاہ (دفین جھونسی ؁۹۸۰ھ) (۱۶) بن بندگی شیخ عبدالملک (۱۷) بن شیخ نعم اللہ (۱۸) بن شیخ حبیب اللہ (۱۹) بن المخدوم شیخ محمد (۲۰) بن المخدوم القاضی عیسیٰ (۲۱) بن تاج الدین (۲۲) ابن بہاؤالدین۔

ہمارے یہ مورث اعلیٰ نسباً صدیقی اور مشرباً نظامی و چشتی تھے، شہر بنارس کے مشہور مشائخ طریقت شیخ مبارک سوندھو، شیخ فرید، شیخ طیب بن معین، شیخ یٰسین بنارسی (صاحب مناقب العارفین، قلمی جو ؁۱۰۴۵ھ میں لکھی گئی) وغیرہم اسی سلسلہ میں بیعت تھے۔

ہمارے اجداد کا شجرۂ نسب حضرت محمد بن ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ پر منتہی ہوتا ہے، جن کے صاحبزادے ابوعبدالرحمٰن قاسم بن محمد رحمہ اللہ ہیں، چونکہ حضرت محمد کے بڑے بھائی کا نام بھی عبدالرحمٰن تھا، اس لئے بہت سے لوگوں کو چچا بھتیجے کے ناموں کے اشتراک سے غلط فہمی بھی ہوگئی ہے، حضرت قاسم فقہائے مدینہ میں شمار ہوتے تھے۔

یعنی حضرت شیخ محمد بن عیسیٰ جونپوری حضرت محمد بن ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہما کی نسل سے تھے جیسا کہ منہج الانساب میں مذکور ہے۔ (الاعلام [نزہۃ الخواطر] کی عبارت ملاحظہ ہو: **الشیخ محمد بن عیسیٰ الجونپوری، الشیخ الامام الکبیر العلامۃ محمد بن عیسیٰ ابن تاج الدین ابن بھاؤ الدین الحنفی**

الصوفی الجونپوری کان من نسل محمد ابن ابی بکر الصدیق کما فی منهج الانساب. الاعلام ، ج:۳، ص: ۱۱۱)

راقم السطور کو یہاں نسب کی تفصیلات سے بحث نہیں کرنی ہے لیکن اس موقع پر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے، جو حضرت شیخ محمد بن عیسیٰ علیہ الرحمہ سے متعلق ان کے عام تذکروں میں راہ پا گئی ہے، ہم یہاں صاحب ''اخبار اخیار'' کو سامنے رکھتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

(تذکرہ کا عنوان ہے ''شیخ محمد عیسیٰ'' تذکرہ یوں درج ہے)

> '' آپ جونپور کے مشائخ اور راہِ خدا کے صادقین میں سے ہیں ، بڑے صاحب مقامات اور صاحب احوال بزرگوں میں سے ہیں، یہ ان بزرگوں میں سے ہیں جن کی بزرگی ، عظمت اور کرامت نا قابل انکار ہے۔ شیخ فتح اللہ اودھی کے مرید ہیں، ان کے والد شیخ احمد عیسیٰ اکابر دہلی میں سے تھے، شورش تیمور کے وقت جب بہت سے اکابر جونپور چلے گئے تو یہ بھی ان لوگوں کے ہمراہ تھے، اور شیخ محمد عیسیٰ اس وقت سات آٹھ سال کے تھے ، اور سعادت ازلی کے تقاضے سے کم عمری ہی میں حضرت شیخ فتح اللہ اودھی سے مرید ہوگئے تھے، اس کے باوجود اپنے مرشد کے ارشاد پر ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی خدمت میں تحصیل علم کی۔ قاضی شہاب الدین نے اصول بزدوی کی جو شرح بحث امر تک لکھی تھی وہ دراصل انھیں کے لئے لکھی ہے۔ علم سے فارغ ہونے کے بعد شیخ کی خدمت میں رہ کر تزکیۂ باطن میں مشغول ہوگئے۔ (اخبار اخیار: ص:۱۸۶ کی عبارت کا ترجمہ یہاں پیش کیا گیا ہے)

اس چند سطری عبارت میں دو مسامحات ہوگئی ہیں، پہلی مسامحت تو حضرت شیخ محمد کی ولدیت میں ہوگئی کہ والد کا نام ''احمد عیسیٰ'' لکھ دیا ہے، جبکہ والد کا نام ''عیسیٰ''

ہے۔ احمد تو شیخ محمد کے چھوٹے بھائی کا نام ہے، قدیم دور میں ابنیت اور ولدیت کو صرف اضافت سے ذکر کیا کرتے تھے، ابن لفظ درمیان میں نہ ہوتا تھا، اس لئے ان دونوں بھائیوں کے نام بھی اسی طرح لکھے گئے ہیں، محمد عیسیٰ (یعنی محمد بن عیسیٰ) احمد عیسیٰ (یعنی احمد بن عیسیٰ) یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہو۔

دوسری مسامحت یہ ہوئی ہے کہ شیخ محمد کی عمر ترکِ سکونت دہلی کے وقت آٹھ سال لکھی ہے، جو کسی طرح نہ تو صحیح ہے نہ قابل یقین۔ تفصیل یہ ہے کہ کتب تذکرہ میں شیخ فتح اللہ اودھی کا جونپور میں قیام مذکور نہیں ہے اور سب سے بڑی اور قابل توجہ بات یہی ہے کہ شیخ محمد عیسیٰ کی تاریخ ولادت عام کتب تذکرہ میں ۷۸۰ھ لکھی ہے، اور حملہ تیمور اور شورش کا زمانہ ۸۰۱ھ باتفاق بتایا جاتا ہے، ایسی صورت میں ۷۸۰ھ میں پیدا ہونے والا ۸۰۱ھ میں سیدھے بیس سال کا ثابت ہو جاتا ہے، اس لئے حضرت شیخ کی عمر اس وقت سات آٹھ سال کی سمجھنا مشکل ہے۔

یہ مسامحت بھی ممکن ہے کتابت کی راہ سے آ گئی ہو، اور ''اخبار اخیار'' نے یہ عمر ہفتدہ ہشتدہ لکھی ہو پھر کسی کاتب نے ہفت اور ہشت لکھ دیا ہو۔

صورت حال یہ ہے کہ تاریخ کے جس دور سے حضرت مخدوم شیخ محمد جونپوری تعلق رکھتے ہیں اس دور میں علماء و مشائخ کے عام تذکرے بالعموم لکھے نہ جا سکے تھے، اس لئے اس دور کی تاریخ پر بے علمی اور بے خبری کا پردہ پڑا ہوا ہے۔

حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ صاحب ''اخبار اخیار'' کا دور بہت بعد کا ہے، اور دہلی و جونپور کے درمیان فاصلہ بھی خاصا ہے اس لئے ان کی یہ مسامحات حق مسامحات رکھتی ہیں، بعد کے دور میں جن حضرات نے مضامین یا تذکرہ کی کتابیں لکھیں انھوں نے بھی صرف پیش رو تذکرہ نگاروں کی تحریر پر اعتماد کرتے ہوئے ان کی روایات کو نقل کر دیا ہے، تحقیق و درایت کا پہلو بعض بعض مقامات پر نظر انداز ہو گیا ہے۔

چنانچہ مخدوم حضرت شیخ محمد کی عمر سکونت دہلی ترک کرنے کے وقت دوسرے اہل تذکرہ نے بھی سات آٹھ سال لکھ دی ہے، اور ایسا غالباً ''اخبار اخیار'' کے اعتبار پر ہوگیا ہے، لیکن درایت کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر حضرت شیخ محمد جونپوری علیہ الرحمہ کی ولادت ۸۰۷ھ ہے تو سکونت دہلی ترک کرتے وقت ان کی عمر بیس سال کے قریب ہونی چاہیئے، کیونکہ حملۂ تیمور باتفاق مورخین ۸۰۱ھ میں ہوا ہے۔

(۲) دوسرے باب میں ایک ذیلی عنوان ''تعلیم کا ہے، اس عنوان کے تحت فاضل تذکرہ نگار مولانا اعجاز احمد اعظمی نے بھائی جی مرحوم کی ابتدائی تعلیم سے متعلق جو لکھا ہے وہ بظاہر ظن وتخمین پر مبنی ہے، اور یہ ظن وتخمین واقعات کی ترتیب کو نظر میں رکھتے ہوئے قابل غور اور محل تامل ہے، کیونکہ بھائی جی کی ولادت ۱۳۳۷ھ (۱۹۱۹ء) میں ہوئی تھی، اور ۱۳۴۱ھ سے پہلے ہی مچھلی شہر کا قیام ختم ہو چکا تھا، غالباً ۱۳۳۹ھ یا ۱۳۴۰ھ میں ہم لوگ الہ آباد منتقل ہو چکے تھے۔

الہ آباد میں حضرت مولوی دادا علیہ الرحمہ ہم لوگوں کے ساتھ نہیں رہے ہیں بلکہ بخشی بازار کے اس مکان میں رہے ہیں جس میں حضرت مصلح الامت علیہ الرحمہ اپنے افاضات وافادات کے ساتھ مقیم رہے، اور اب قاری شاہ محمد مبین صاحب دامت برکاتہم قیام فرما ہیں۔

اس مکان کا وہ کمرہ جس میں اس وقت مولوی عرفان احمد صاحب سلّمہٗ (خویش حضرت قاری صاحب مدظلہ) کا قیام ہے اسی کمرہ میں مولوی دادا علیہ الرحمہ کا قیام تھا، اور ہم لوگ الہ آباد کے مختلف مکانات میں رہتے رہے ہیں۔ حضرت مولوی دادا اور بھائی جی کی یکجائی صرف ڈھائی تین سال مچھلی شہر میں رہی ہے، اس کے بعد وہ الہ آباد آگئے تھے، اپنے اندازہ کے مطابق ۱۳۴۵ھ، ۱۳۴۶ھ میں مولوی دادا کا انتقال ہوگیا ہے، ہم لوگ اس وقت محلّہ اٹالہ حافظ منزل کے کوارٹر میں رہتے تھے، اسی کوارٹر

سے مولوی دادا علیہ الرحمہ کی دوا لے کران کی خدمت میں جانا یاد ہے۔

مختصر یہ کہ قیام مچھلی شہر کے زمانے میں بھائی پڑھنے پڑھانے کی عمر ہی کو نہیں پہونچے تھے، جب وہ عمر آئی تو مولوی دادا ساتھ نہ تھے، اس لئے ان سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا، ہاں یہ ظاہر ہے کہ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی ہوگی کہ جد امجد حافظ فضل حق صاحب مرحوم بھی گٹھیا کے مریض ہونے کی وجہ سے خانہ نشین اور صاحب فراش ہی تھے، ان سے پڑھنا قرین قیاس ہے۔

بھائی جی کی تعلیم کے اس دور سے متعلق جب وہ اسکول سے علیحدہ ہو گئے ہیں اور مدرسۂ اشرفیہ میں ابھی داخل نہیں ہوئے ایک عبوری دور اور بھی رہا ہے، جس کا ذکر آجانا چاہئے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہمارے والد صاحبؒ نے ہم لوگوں کو گھر سے باہر رہنے کا بتدریج عادی بنایا تھا۔

احقر ۱۳۵۱ھ میں حفظ قرآن (دس سال کی عمر میں) مکمل کر چکا تھا، اور بھائی جی اس وقت تک اسکولی تعلیم ساتویں، آٹھویں تک حاصل کر چکے تھے، تو والد صاحب نے ہم دونوں بھائیوں کو شہر الہ آباد سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر موضع مریا ڈیہہ میں مخدومی واستادی حضرت حافظ محمد یٰسین صاحب علیہ الرحمہ کی خدمت میں بھیج دیا تھا، جو اپنے گاؤں میں بلکہ اپنے گھر پر ڈسٹرکٹ بورڈ کی طرف سے قائم پرائمری اسکول کے صدر مدرس تھے اور حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب علیہ الرحمہ کے معتمد خاص اور مجاز بھی تھے، حافظ صاحب اگرچہ عالم نہ تھے لیکن فارسی کی تعلیم رکھتے تھے، اردو تحریر بھی بہت عمدہ تھی۔ حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب کی تالیف کردہ کتاب ''بہشتی ثمر'' پر ناقل عفی عنہ کے عنوان سے جو حاشیے ہیں وہ انھیں حافظ یٰسین صاحب کے ہیں۔

ان ہی کی خدمت میں ہم دونوں بھائی رہتے تھے، بھائی جی نے ان سے بہشتی زیور، صفائی معاملات، اوجز السیر وغیرہ اور کچھ فارسی پڑھی تھی۔ راقم السطور نے درجہ

سوم میں داخلہ لے رکھا تھا اور ساتھ ہی قرآن مجید کا دور بھی کرتا۔

اس کے بعد پھر والد صاحب کا الہ آباد سے تبادلہ ہوگیا، احقر والد صاحب کے ساتھ ساتھ پہلے فتح گڈھ میں، پھر فتح پور میں رہا، اور بھائی جی الہ آباد کے مکان میں چچا کے ساتھ رہ گئے، اور مدرسۂ اشرفیہ میں تعلیم حاصل کی پھر سہارن پور چلے گئے، جب والد صاحب کا قیام فتح پور میں تھا احقر نے وہیں مدرسۂ اسلامیہ میں شاخ عربی میں عربی شروع کی اور ایک سال بعد احقر بھی انھیں کے ساتھ سہارن پور چلا گیا۔

(۳) ”بارگاہِ تھانوی میں“...... بھائی جی احقر سے ایک سال پہلے مظاہر علوم سہارنپور پہونچ چکے تھے، ظن غالب ہے کہ بارگاہِ تھانوی میں ان کی حاضری اس پہلے سال میں بھی دو ایک بار ضرور ہوئی ہوگی، اس کے بعد کی تمام حاضریوں میں احقر بھی ساتھ میں حاضر ہوتا رہا۔

حاضری کے موقع پر جو تحریر تذکرہ میں نقل ہوئی ہے یہ تحریر جس وقت کی حاضری سے متعلق ہے اس میں احقر میں بھی ساتھ تھا۔ پورا واقعہ اس طرح ہوا تھا کہ مظاہر علوم سے ہم کئی طلبہ ایک ساتھ حاضر ہوئے تھے، اس سے پہلے کی حاضریوں میں بھی یہی صورت ہوا کرتی تھی کہ ہم لوگ بعد ظہر کی مجلس عام میں حاضر ہوتے اور بوقت ملاقات ومصافحہ صرف اتنی طلاع دے دیا کرتے تھے کہ احقر کا نام یہ ہے، مظاہر علوم میں پڑھتا ہے، زیارت کے لئے حاضر ہوا ہے، ایک روز یا دو روز قیام رہے گا، اس کے بعد اپنی جگہ آ کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔

اسی معمول کے مطابق اس روز کی حاضری میں بھی یہی کیا تھا، اور بھائی جی حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہ اطلاعات دیدیں، تو حضرت نے ان سے سوال فرمالیا کہ یہاں کے قواعد معلوم ہیں؟ بھائی جی نے اثبات میں جواب دیدیا تو فرمایا لکھ کر لے آؤ۔ بھائی جی کے بعد احقر حاضر ہوا اور ضروری اطلاعات دیدیں، تو

احقر سے بھی یہی سوال ہوا کہ یہاں کے قواعد معلوم ہیں؟ احقر نے کہہ دیا کہ بھائی جی کے ساتھ ہوں، تو فرمایا کہ وہ ہر وقت ساتھ ساتھ رہیں گے؟ پھر دوسرے ساتھی حاضر ہوئے اور ہر ایک کو اسی سوال کی جوابدہی کے لئے لوٹنا پڑا۔

بھائی جی نے خانقاہ میں آویزاں قواعد وضوابط نقل کر لئے اور حاضر ہوئے، مگر وہ کافی نہ ہوئے، تو پھر خانقاہ میں مقیم کسی صاحب نے ہم لوگوں کی بے بسی پر ترس کھا کر یہ دفعہ تلقین کی کہ یہ بھی لکھ دیں کہ اگر یہاں کے قیام سے کوئی نفع اور فائدہ نہ ہوگا تو حاضری پر پچھتاوا اور افسوس نہ ہوگا۔

ان بزرگوار کی تلقین پر عمل کرتے ہوئے بھائی جی نے جو تحریر لکھی ہوگی تذکرہ میں وہی تحریر نقل ہوئی ہے۔

اس کے بعد ہم سب کی مشکل حل ہوگئی اور ہر ایک نے اس مضمون کا جواب لکھ دیا، تو حضرت مجلس میں فرمانے لگے کہ دیکھئے اب سب کو الہام ہونے لگا۔

بھائی جی نے اپنی زندگی میں کتنے شاگرد چھوڑے، فاضل تذکرہ نگار نے اس پہلو کی طرف توجہ نہیں فرمائی، اس لئے مختصراً کچھ اس موضوع کا بھی تذکرہ ہو جائے۔

بھائی جی کے باقاعدہ اور باضابطہ تلامذہ کی فہرست تو خاصی طویل ہوگی جنھوں نے مدرسۂ اسلامیہ ہسوہ یا مدرسہ وصیۃ العلوم الہ آباد میں آپ سے پڑھا ہے۔ ان کے علاوہ بعض حضرات ایسے ہیں ہوئے ہوں گے جنھوں نے باقاعدہ اور باضابطہ تو آپ سے نہیں پڑھا تھا، لیکن وہ اعتراف اور اقرار کرتے تھے کہ مولانا عبد الرحمٰن جامی صاحب میرے استاذ ہیں۔ میں نے عربی کی ابتدائی کتابیں ان سے اس وقت پڑھی ہیں جب وہ خود مدرسہ مظاہر علوم میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، ایسے لوگوں میں سے ایک نام احقر کے علم میں ہے............ یعنی مولانا محمد اللہ علیہ الرحمہ رامپوری جو مولانا اسعد اللہ صاحب علیہ الرحمہ کے صاحبزادے اور مظاہر علوم میں مدرس تھے۔ حضرت

---

(۱) معارف ص: ۳۷۲، ماہ نومبر ۱۹۵۴ء، جلد نمبر ۷۴۔ خاندانی بیاض مولانا عبد القدوس رومیؔ کے پاس موجود ہے، جو نہایت مستند ہے، مولانا موصوف اسے بڑی دیدہ ریزی اور تحقیق کے ساتھ مرتب کر رہے ہیں، اس میں نسب کی تمام تفصیلات موجود ہیں۔

مولانا علیہ الرحمہ نے راقم السطور کو ان کا قرآن شریف کا دَور کرانے کے لئے اور بھائی جی مرحوم کو انھیں عربی کی ابتدائی کتب پڑھانے کے لئے مقرر فرمایا تھا۔

مدرسہ اسلامیہ فتحپور کے خصوصی تلامذہ ہیں:

مولانا حامد اختر صاحب زید مجدہم (صدر مدرس منبع العلوم، اٹاوہ) مدرسہ جامع العلوم کان پور کے صدر مدرس مولانا مبین الحق صاحب قاسمی، اور مولانا نفیس اکبر صاحب زید مجدہم جو جامعہ عربیہ ہتھورا (باندہ) کے صدر مدرس اور استاذ حدیث بھی ہیں، بعد میں بھائی جی کے سمدھی بھی ہوگئے، ان کی صاحبزادی سلّمہا عزیزم مولوی محی الدین سلّمہٗ سے منسوب ہیں، اور مولانا انتظام حسین صاحب مرحومؔ (مرحومؔ آپ کا تخلص ہے، الحمدللہ بقید حیات ہے) بھی تلمذ رکھتے ہیں۔

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل حضرات کو بھی بھائی جی سے تلمذ رہا ہے۔

بھائی جی فتح پور ہسوہ کو خیر باد کہہ کر جب فتح پور تال نرجا گئے تو حضرت مصلح الامت علیہ الرحمہ نے حضرت قاری محمد مبین صاحب اور مولانا قمر الزماں صاحب کی بھی تعلیم آپ سے متعلق رکھی، راقم السطور کے ہمزلف برادرم مولوی محمد یونس صاحب (ناظم وصدر مدرس دعوت الحق کڈی، اتر گجرات) نے بھی اس وقت آپ سے پڑھا ہے۔

پھر حضرت مصلح الامت علیہ الرحمہ الہ آباد تشریف لے آئے اور بخشی بازار میں مستقل خانقاہ اور باقاعدہ مدرسہ کا نظم ہوگیا تو اس مدرسہ میں تدریس کے دوران مولانا عمار احمد صاحب سلّمہٗ اور برادر عزیز مولوی حافظ عبد العلیم عیسیٰ سلّمہٗ، مولوی نور الہدیٰ صاحب، مولوی ارشاد احمد صاحب، مولوی انوار احمد صاحب، مولوی عرفان احمد صاحب سلّمہٗ، مولوی صوفی قمر صاحب، مولوی ارشد صاحب بنارسی، صوفی ظہیر صاحب (مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) عزیز القدر مولوی ظفر احمد صدیقی (مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) اور راقم السطور کے ہمشیرہ زادہ مولوی زین الاسلام قاسمی سلّمہٗ، مولوی مجیب الغفار

صاحب (بنارس) مولوی خالد حسین بلیاوی (کتاب کی اشاعت سے کچھ عرصہ پہلے مارچ میں انتقال ہوگیا) مولوی سعادت علی صاحب (گورینی) مولوی عبد الرحیم صاحب جونپوری، مولوی عبد التواب سلّمہٗ (گورکھپور) مولوی احمد متین قاسمی سلّمہٗ، مولوی احمد مکین سلّمہٗ مظاہری، اور برادر زادہ عزیزم مولوی محی الدین سلّمہٗ، مولوی محمد حسن قاسمی صاحب آپ کے باقاعدہ شاگرد ہیں۔

ذکر جامیؔ کی کتابت شدہ کاپی دیکھنے کے بعد یہ چند ضروری استدراکات ذہن میں آگئے جو بے تکلف لکھ دیئے گئے، اب شیخ سعدی کا مشہور شعر اپنے ترجمۂ منظوم کے ساتھ لکھ کر اپنی بات ختم کرتا ہوں ؎

نام نیکو رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نام نیکت برقرار
جو نیک نام گذرے ہیں ان کو بھی رکھو یاد
باقی رہے گا اس سے تمہارا بھی نیک نام

☆☆☆☆☆

تکملۂ خاتمہ جو صاحب سوانح کے ''حسن خاتمہ'' اور ان کے مقام عزیمت کا پتہ دیتا ہے

محترم بھائی جی علیہ الرحمہ کی وفات کے موقع پر میں تو آگرہ میں تھا، وفات کی اطلاع ملنے پر جب تعزیت میں الہ آباد آنا ہوا، اور عزیز القدر مولوی حافظ محی الدین جامی سلّمہٗ سے ان کی بیماری کے حالات اور دوسری تفصیلات معلوم ہوئیں تو ان تفصیلات میں بھائی جی کے اس ''مقام عزیمت'' نے احقر کو خاص طور سے متاثر کیا کہ ان کا یہ مرضِ وفات ماہِ رمضان المبارک میں شروع ہوا تھا، بھائی جی کے مکان کے قریب ہی

محترم ڈاکٹر عظیم اللہ صاحب رہتے ہیں، فوری طور پر انھیں سے رجوع کیا گیا، انھوں نے بھائی جی کو دیکھا اور اپنے دواخانہ سے دوائیں دیں مگر مرض میں افاقہ نہ ہوسکا تو انھوں نے بھائی جی سے کہا کہ آپ کا علاج یہاں گھر پر ٹھیک نہ ہوسکے گا، اس لئے مناسب یہ ہوگا کہ آپ کسی نرسنگ ہوم میں رہ کر علاج کریں، وہاں ہر طرح کی مشینیں اور علاج کی سہولتیں موجود ہیں، ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا مشورہ خلوص وہمدردی کی بنا پر تھا، اور یہ کوئی ایسا مشورہ بھی نہ تھا جو دشوار یا ناقابل عمل ہوتا کہ اس دور میں اکبر الہ آبادی کے شعر پر عمل تو شاید ہر مریض ہی کو کرنا پڑتا ہے کہ ع

کٹی عمر ہوٹلوں میں ’’مرے اسپتال جا کر‘‘

لیکن بھائی جی نے ڈاکٹر صاحب سے صاف کہہ دیا کہ مجھے نرسنگ ہوم اور اسپتال میں داخل نہیں ہونا ہے، یہیں گھر پر رہتے ہوئے جو کچھ علاج ممکن ہو کر لیا جائے اور بس۔ چنانچہ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کی پیشکش سے اپنی معذوری ومجبوری صاف ظاہر کردی اور اپنے گھر پر اپنے متعلقین کی موجودگی میں کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے اور حاضرین کو اپنے ایمان اور خاتمہ بر ایمان کا شاہد وگواہ بناتے ہوئے رخصت ہوگئے ...... اور یہ رخصت وقت مقررہ پر بہر حال ہونی تھی چاہے نرسنگ ہوم میں ہوتی یا کہیں اور ہوتی۔

بھائی جی مرحوم کا یہ ’’مقام عزیمت‘‘ قابل توجہ اور لائق تقلید ہے، خود ان کے معالج محترم ڈاکٹر عظیم اللہ صاحب بھی ان کے انتقال کے بعد عزیزم مولوی محی الدین سلّمہٗ سے بوقت تعزیت یہ اعتراف اظہار فرمایا کہ موصوف ’’ایماندار‘‘ آدمی تھے، ڈاکٹر صاحب نے ان کے اس عمل کو ’’ایمان‘‘ ہی پر مبنی سمجھا۔

احقر اس سلسلہ میں کوئی شرعی فتویٰ دینے کی ہمت وجسارت نہیں کرسکتا، لیکن علاج کے سلسلہ میں حد سے بڑھ کر تگ ودو کرنے میں یک گونہ کھٹک ضرور محسوس کرتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ علاج از روئے شرع مامور ومطلوب تو ہے لیکن اس سلسلہ میں جو

’’انتہا پسندی‘‘ عمل میں لائی جاتی ہے کہ ’’مرضِ وفات‘‘ کا تقریباً یقین ہو جانے کے باوجود مریض کو یہاں سے وہاں، اور اس شہر سے اس شہر، اور اس ملک سے اس ملک لئے پھرتے ہیں، اور پھر اسی صورت حال کے نتیجہ میں بعد کو ’’نقل میت‘‘ کی نوبت آجاتی ہے جو مستقل طور پر ایک مدت سے موضوع بحث بنی ہوئی ہے۔

احقر ’’نقل میت‘‘ کے مسئلہ کو اسی علاج کی ’’انتہا پسندی‘‘ سے جڑا ہوا اور اسی کا لازمی نتیجہ سمجھتا ہے۔ احقر کو اس قسم کی انتہا پسندی بہر حال پسند نہیں ہے، اللہ تعالیٰ راہِ حق کی ہمیشہ رہنمائی فرماتا رہے، آمین۔

والسلام
احقر رومی

◆ ◆ ◆ ◆ ◆

ارشادات

حضرت مولانا محمد قمر الزماں صاحب الہ آبادی مدظلہٗ

اُستاذ مکرم حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامیؒ اپنی خدمات علمیہ ودینیہ کی وجہ سے عوام وخواص میں معروف ومشہور ہیں، یقیناً انھوں نے حضرت مصلح الامتؒ کے مواعظ وملفوظات کو جمع وترتیب دے کر کارِ عظیم انجام دیا ہے، جوامت کے لئے انتہائی مفید اور کارآمد علوم ومعارف کا خزینہ ہے۔ مزید یہ کہ آپ ’’حالات مصلح الامت‘‘ کے عنوان سے رسالہ ’’معرفت حق‘‘ اور ’’وصیۃ العرفان‘‘ میں قسط وار مضمون لکھتے رہے، جواب ماشاءاللہ یکجا کر کے ’’حالات مصلح الامت‘‘ ہی کے نام سے تین ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں جو نہایت بصیرت افروز ونصیحت آموز مضامین پر مشتمل ہیں، اور سالکین راہ بلکہ جملہ متوسلین کے لئے ہر ہر موڑ پر شمع راہنما ہے۔

اس کے علاوہ مولانا جامی صاحبؒ نے بعض اہم کتابوں کے ترجمے بھی کئے ہیں، جن کی تفصیل چودھویں باب میں تالیفات کے عنوان کے تحت ذکر کی گئی ہے۔

آپ صبر وعزیمت کے نہایت اعلیٰ مقام پر فائز تھے، ایک عرصہ سے مرض نقرس میں مبتلا تھے، درد وتکلیف بھی رہتی تھی، مگر کوئی حرف شکایت زبان پر نہ لاتے تھے بلکہ چہرہ بشرہ سے بھی اس کا اندازہ نہیں ہوتا تھا، اخیر تک ہر شخص سے نہایت بشاشت سے ملتے تھے، بلکہ اپنی خوش مزاجی کے مطابق مزاح کی باتیں بھی فرماتے تھے۔

اس کے علاوہ حضرت مصلح الامت کی رفاقت میں اتنی طویل مدت کے قیام میں ظاہر ہے کہ یُسر وعُسر، نشاط وعتاب ہر قسم ہی کے حالات پیش آئے، مگر ہر حال میں صبر وشکر پر ثابت قدم رہے۔

ادھر حضرت مصلح الامتؒ بھی آپ کے صدق وخلوص کی قدر فرماتے تھے اور گھر کے خاص فرد کی طرح ان کے ساتھ معاملہ فرماتے تھے، اپنے خصوصی مکان میں آپ کو مع اہل وعیال کے رہائش کے لئے ایک حصہ دے رکھا تھا، آپ کو اپنے اس سفر حج میں ساتھ رکھا جو حضرت کے لئے سفر آخرت ثابت ہوا، اس طرح آپ کو حضرتؒ کے حیات طیبہ کے اخیر لمحہ تک ساتھ رہنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

ایک طویل عرصہ کی علالت کے بعد ۱۰؍رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ کو دار آخرت کی طرف رحلت فرمائی، إنا للہ وإنا إلیہ راجعون، اور الہ آباد کے مشہور قبرستان واقع محلّہ اکبر پور میں مدفون ہوئے۔ نور اللہ مرقدہٗ

ایسے مخلص خادم دین کی سوانح لکھی جانی ضروری تھی، تا کہ ان کے نقوش زندگی بعد میں آنے والوں کیلئے مشعل راہ ہوں، خوشی کی بات ہے کہ اس کی طرف مولانا اعجاز صاحب اعظمی نے توجہ فرمائی، اور مفصل سوانح لکھی جو یقیناً بصیرت افروز اور سبق آموز بھی ہے۔ فجزاھم اللہ تعالیٰ

محمد قمر الزماں عفی عنہ

* * *

تأثر

حضرت مولانا نفیس اکبر صاحب دامت برکاتہم

شیخ الحدیث وصدر مدرس جامعہ عربیہ ہتھورا۔ باندہ

استاذ مکرم حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامیؔ نور اللہ مرقدہ کی سوانح حیات ’’ذکر جامی‘‘ کا مسودہ میں نے بالاستیعاب پڑھا، پڑھ کر بہت متاثر ہوا۔ مولانا جامیؔ صاحب کا عطر بیز ذکر اور حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہٗ کا مبارک قلم نورٌ علیٰ نور ہوگیا۔ اس کتاب کی اشاعت سے مجھے خوشی ہوئی، اللہ تعالیٰ خوب بابرکت فرمادے۔

حضرت مولانا جامیؔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرسۂ اسلامیہ فتحپور میں مدرس تھے اور ناچیز مدرسہ کا طالب علم تھا، ان کا شفقت و پیار بھرا درس آج بھی یاد آتا ہے۔ شرح جامی میں نے انھیں سے پڑھی تھی۔ ان کے صاحبزادے مولانا محی الدین سلّمہٗ میرے داماد ہیں۔

اللہ تعالیٰ صاحب تذکرہ کو بلند درجات سے نوازے اور تذکرہ نگار کو ان کی کاوش ونگارش کا اجر وصلہ عطا فرمائے۔

⁂

باب ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ اجمعین .

تمہید وتعارف

غالباً ۱۳۹۳ھ کی بات ہے، عیسوی سن ۱۹۷۳ء رہا ہوگا مجھے رسمی طالب علمی سے فارغ ہوئے صرف دو تین سال ہوئے تھے، زمانہ کے بعض حوادث نے مجھے ہر طرف سے کاٹ کر دین اور دینی تعلیم کی طرف یکسو کر دیا تھا، طبیعت کو تصوف کا ذوق ابتدا ہی سے تھا ان حوادث نے تو بالکل ہی اس کے آستانہ پر ڈال دیا تھا۔ غازی پور کے مدرسہ دینیہ سے تدریسی زندگی کا آغاز ہوا، مدرسہ دینیہ میں اس وقت درجات عربی کے طلبہ کی تعداد بہت قلیل تھی اتنی قلیل کہ نہ ہونے کے برابر! میرا وقت بہت کچھ خالی تھا کوئی اور مصروفیت بالکل نہ تھی زیادہ تر وقت کتابوں کے مطالعہ میں بسر ہوتا۔

ایک روز ایک صاحب کے یہاں الہ آباد سے نکلنے والا رسالہ ”معرفت حق“ ہاتھ آیا، یہ نام میرے لئے نیا نہ تھا لیکن بالاستیعاب اس کے مطالعہ کا اتفاق نہ ہوا تھا، یہ رسالہ مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری ثم الہ آبادی نور اللہ مرقدہ کے افادات ومضامین پر مشتمل تھا۔ حضرت مولانا سے قلبی عقیدت ومحبت تو بہت پہلے سے تھی مگر ان کی کتابیں اور ملفوظات وغیرہ اب تک پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، ہاتھ

میں لیا اور چند صفحے پڑھے تھے کہ طبیعت بے اختیار کھنچتی چلی گئی وہ شمارہ ایک ہی مجلس میں پڑھ ڈالا، مدرسہ دینیہ کے کتب خانے میں چند شمارے ملے انھیں بھی آناً فاناً پڑھ ڈالا، اب شوق کی بیتابی بڑھی، پیاس شدید ہو، حلق میں کانٹے پڑ رہے ہوں رگیں تمام سوکھ رہی ہوں ایسی حالت میں شیریں اور ٹھنڈے پانی کا ایک پیالہ کسی کو پلا دیجئے پھر دیکھئے کہ اس کی تشنگی کتنی بھڑک اٹھتی ہے، بے اختیار اسے دوسرے اور تیسرے کی خواہش بڑھتی چلی جائے گی، ایک طرف آسودگی اور ٹھنڈک کا احساس بھی ہوتا جائے گا اور دوسری طرف پانی کی طرف لپک بھی بڑھتی چلی جائے گی، ٹھیک یہی کیفیت اس وقت میری بھی ہوئی۔ چند رسالے تھے وہ پورے ہو گئے اب شوق بیتاب تھا کہ اور ملیں تو انھیں بھی پڑھوں، حضرت مولانا کے متوسلین اور خلفاء میں ایک بزرگ مولانا حکیم بشیر الدین صاحب علیہ الرحمۃ اس وقت ہمدرد دواخانہ میں بحیثیت طبیب مامور تھے ان سے ذکر کیا تو انھوں نے متعدد پرچے حوالے کئے انھیں بھی پڑھ گیا، باقی کی جستجو بڑھی تو انھوں نے مشورہ دیا کہ الہ آباد جامی صاحب کو لکھئے پرچہ وہی نکالتے ہیں حالانکہ پرچے پر کہیں ان کا نام نہ تھا مگر فرمایا کہ جامی صاحب ہی کے اہتمام وانصرام میں یہ پرچہ شائع ہوتا ہے، یہ نام میرے لئے نیا تھا میں تو صرف ”شرح جامی والے“ ملا جامی کو جانتا تھا یہ اس زمانے میں کون صاحب جامی ہو گئے؟ معلوم ہوا کہ شرح جامی والے مولانا عبدالرحمٰن جامی کے ٹھیک ہمنام یہ بھی مولانا عبدالرحمٰن جامی ہیں۔ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کے کاتب خاص، ان کے یہاں روز وشب کے حاضر باش، ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے یکسو ہو کر ان کی خدمت میں خود کو ڈال دینے والے۔ حضرت مولانا کے تمام لوگوں کو ان پر خاص اعتماد ہے اور وہ مولانا کے علوم ومعارف کے امین ومحافظ اور شارح وترجمان ہیں۔

میں نے بے تابیٔ شوق سے معمور ہو کر ایک خط ان کے نام لکھ دیا انتظار زیادہ

نہیں کرنا پڑا جواب جلد آیا اور یہ بشارت لے کر آیا کہ جتنے پرچے دفتر میں موجود ہیں سب بھیجے جا رہے ہیں۔ میں سراپا انتظار بن گیا، ان کے آنے میں دیر ہوئی تو دوسرا خط لکھا، اس طرح جامی صاحب سے تعارف کی طرح پڑ گئی، جامی صاحب نے میرے دونوں خط ‘‘معرفت حق’’ میں شائع کر دیئے، ان خطوط کے کچھ اقتباسات ناظرین بھی ملاحظہ فرمالیں تاکہ اس سے اندازہ ہو جائے کہ قلب و دماغ کی اس وقت کیا کیفیت تھی۔

‘‘ابھی چند روز ہوئے معرفت حق کا دسمبر ۱۹۷۲ء کا شمارہ ایک صاحب سے دیکھنے کو ملا اس سے پہلے بھی بعض شمارے متفرق طور پر دیکھے تھے مگر کل امر مرھون باوقاتہ کے تحت اس وقت کوئی خاص اہمیت نہ دی اب جس وقت ہاتھ آیا اور اس کے مضامین پڑھے تو چونک اٹھا بلاشبہ عجیب چیز ہے۔ حضرت مصلح الامت کے نفس گرم کی تاثیر سنی تو ضرور تھی احساس اب ہوا۔ بے اختیار دل کھنچتا چلا گیا، لفظ لفظ میں عجیب وغریب کیف محسوس ہوا، حقیقت یہ ہے کہ حضرت کے ملفوظات بیمار انسانیت کے لئے آب حیات ہیں ان کو بار بار پڑھتا ہوں اور ہر مرتبہ ایک نیا لطف حاصل ہوتا ہے، بہت جلد حضرت کی تصنیفات بھی خریدوں گا کہ ان پر اگر مال صرف کیا جائے تو عین موقع و محل پر خرچ ہوگا۔

جناب من! یہ چیزیں تو تمام متاع دنیوی صرف کر کے حاصل کی جائیں تو بھی ارزاں ہیں۔ اس سے زیادہ کیا لکھوں’’

دوسرے خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

‘‘کیا بات ہے کہ وی۔ پی ابھی تک موصول نہیں ہوئی، حکیم صاحب مدظلہ سے کہا تو انھوں نے اطمینان دلایا کہ بس اب آیا ہی چاہتی ہے لیکن ؎

نہ صبر در دل عاشق نہ آب در غربال

لہذا دوسرا خط لکھنے بیٹھ گیا، اس اثناء میں حکیم صاحب کے یہاں سے جتنے رسائل مل سکے ان کا ایک ایک لفظ پڑھ چکا ہوں مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ یہ وہ آب زلال ہے جس کے پینے کے بعد جہاں روحانی سیرابی حاصل ہوتی ہے وہیں شوق وانتظار کی تشنگی بدر جہا بڑھ جاتی ہے۔ جس وقت یہ رسائل دستیاب ہوئے عالم یہ تھا کہ لیل ونہار کی تمام سرحدیں سمٹ کر معرفت حق کے دریائے معرفت میں غرق ہوکر رہ گئی تھیں اور اب بھی ان کی حلاوت ولذت کم نہیں ہوئی ہے۔ (معرفت حق مارچ ۱۹۷۴ء صفر ۱۳۹۴ھ)

میرے دل ودماغ کی یہ کیفیت عرصہ تک برقرار رہی، ربیع الاول ۱۳۹۵ھ میں ایک خط لکھا اس کے بھی چند اقتباس ملاحظہ کرلیں:۔

”ابھی ابھی معرفت حق نے شرف صدور بخشا، سب سے پہلے حالات مصلح الامت پر نگاہ پڑی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا واقعہ اور سوال وجواب جو آپ نے نقل فرمایا ہے بس وہیں تک پہونچ کر رکا ہوا ہوں، عجیب اور بہت عجیب، سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ آپ کو اجر جزیل عطا فرمائے، اس سے پہلے شبلی موذن کا ایک قول نقل کرکے آپ نے ازخود رفتہ کردیا تھا اور حضرت مولانا اعظمی کے واقعہ نے تو پکڑ ہی لیا، سوچتا ہوں کہ حضرت کا فیضان کس طرح بارش کی طرح برسا کرتا تھا کہ ایک عامی اور ایک زبردست عالم سب ایک رنگ میں رنگ گئے تھے۔ بس آپ یہ سب سناتے رہئے، معرفت ہی معرفت ہے۔ جزاکم اللہ

معرفت حق کے روح پرور مضامین کے بارے میں کوئی مجھ سے پوچھے، پانچ سال کے مجلدات میرے پاس ہیں ان کا ایک ایک حرف پڑھ چکا ہوں لیکن سیری نہیں ہو، تی نہ جانے کیا کشش ہے؟ کیا حلاوت ہے؟

ناظرین کو انتظار ہوگا کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کا کون سا

واقعہ ہے جس نے اتنا متاثر کیا اور شبلی موذن کا کیا قول تھا جس نے از خود رفتہ کر دیا تھا، بات ذرا غیر متعلق سی ہے، ناظرین کے ذوق پر گراں گزرنے کا اندیشہ نہ ہوتا تو یہیں سنا دیتا، اب ذرا انتظار کر لیجئے یا ابھی فوراً ہی تھوڑی دیر سلسلہ منقطع کر کے آخر کتاب میں ضمیمہ نمبر ۱، ۲ ملاحظہ فرما لیجئے دونوں واقعات کو کتاب کے آخری صفحات پر نقل کر دیا ہے۔ میں یہاں جامی صاحب سے اپنے تعارف کی ابتداء کا ذکر کر رہا تھا مراسلت ہوتی رہی غائبانہ تعلق و تعارف میں اضافہ ہوتا رہا، پھر ایک بار ایسا ہوا کہ میں نے الہ آباد خانقاہ وصی اللہی میں حاضری بھی دے ڈالی، مہمان جامی صاحب ہی کا رہا، نہایت باغ و بہار، سبک روح اور شگفتہ مزاج انسان سے ملاقات ہوئی، دستر خوان کی ضیافت خوب رہی اور پر لطف گفتگو کی حلاوت خوب تر۔

میں چند سالوں کے بعد وصیۃ العلوم الہ آباد میں مدرس ہو کر پہونچ گیا اور خانقاہ ہی کے مکان کے ایک حصہ میں جس کی اوپری منزل میں جامی صاحب مع اہل وعیال کے مقیم تھے ٹھیک اسی کے نیچے والی منزل میری اور میرے اہل وعیال کی رہائش گاہ قرار پائی۔ اب تو روز و شب کی یکجائی تھی، جامی صاحب کی صحبتیں بڑی پر لطف رہیں۔ ندوہ سرائے کے انیس بھائی مرحوم (۱) بھی وہیں قیام پذیر تھے یہ دونوں بوڑھے تھے میں نوجوان، ڈھائی نفر کی مجلس خوب ہوتی، جامی صاحب حضرت مصلح الامتؒ کے واقعات اور ملفوظات بکثرت سناتے ان کے علوم و معارف بیان کرتے، ان کی شرح کرتے، انیس بھائی بھی منتخب واقعات سناتے اور میں سراپا گوش بنا سنتا رہتا، ایک سال بعد اس مجلس میں ایک خوشگوار اضافہ ہوا یعنی حضرت مولاناؒ کے ایک خادم و عاشق جناب مشتاق احمد صاحب (۲) بھی اس میں شریک ہو گئے دن رات کی یہ صحبتیں بہت معلومات افزا اور پر لطف ہوا کرتیں۔

بعد میں راقم الحروف کے قلم سے حضرت مولانا کا تذکرہ ''حیات مصلح الامت''

کے نام سے جو نکلا اور لوگوں کا یہ خیال رہا کہ میں حضرت کا شرف دیدار رکھتا ہوں اور اگر میں اس کی تصریح نہ کر دیئے ہوتا کہ عالم ناسوت میں میری ملاقات حضرتؒ سے نہیں ہے تو کسی کو وہم بھی نہ ہوتا کہ میں حضرتؒ کی زندگی میں زیارت تک سے محروم ہوں، حیات مصلح الامت میں مشاہدہ کی جو کیفیت جھلکتی ہے اس میں انھیں مجالس چہار درویش کا اثر ہے۔

میں نے جامی صاحب سے...... بالخصوص...... حضرتؒ کا اتنا تذکرہ سنا کہ مجھے بھی یہی گمان گزرنے لگا کہ میں نے گویا حضرت کو دیکھا ہے، حضرت کا کلام سنا ہے، ان کے مواخذے کی کیفیات کا براہ راست مشاہدہ کیا ہے، ان کے طریقۂ تربیت کا عینی شاہد ہوں ان کی مبارک مجالس میں شریک رہا ہوں۔ غرض ایک بے گانہ بالکل یگانہ بن کر رہا۔ اور یہ اثر تھا جامی صاحب کی صحبتوں کا۔

جامیؔ صاحب فنا فی الشیخ تھے انھیں حضرت کی ذات اور حضرت کے کلام سے اور ان کے علوم ومعارف سے ایسی مناسبت تھی کہ وہ سراپا معارف وصی اللہی کی شرح بن گئے تھے۔

◆ ◆ ◆ ◆ ◆

---

(۱) انیس بھائی حضرت مولانا قاری محمد مبین صاحب کے سمدھی تھے، ابھی حال میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے متعلق چند صفحات ضمیمہ:۳ میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) ماشاء اللہ بقید حیات ہیں، چند صفحات میں ان کا بھی حق محبت ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ضمیمہ:۴ میں ملاحظہ فرمائیں۔

باب ۲

نام ونسب اور وطن

مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامیؒ کا آبائی وطن مچھلی شہر ضلع جون پور ہے، جونپور زمانۂ قدیم میں علم وفضل کا گہوارہ رہا ہے، علماء اور مشائخ کی ایک بڑی تعداد نے ہمیشہ یہاں علم وعمل اور مشیخت اور بزرگی کی شمع فروزاں رکھی ہے، جون پور شہر اور اس کے ماتحت قصبات اور گاؤں گاؤں ہر جگہ علم وہنر کی بساط بچھا رکھی تھی یہاں کے علماء اور مشائخ اور ان کی شان علم وتحقیق دیکھ کر شاہجہاں نے کہا تھا کہ ”پورب شیراز ماست“ پورب ہمارا شیراز ہے۔ پورب کا اطلاق اس وقت جون پور کے حلقہ پر ہوتا تھا، جون پور کے نامور قصبات میں ایک مچھلی شہر ہے جو نامور علماء وشعراء اور ادباء کی وجہ سے مشہور ومعروف ہے۔

مورث اعلیٰ:

مولانا جامی کے مورث اعلیٰ تاج العارفین محمد بن عیسیٰ بن تاج قدس سرہٗ ہیں، مخدوم صاحب کے متعلق محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:۔

> محمد بن عیسیٰ بن تاج الدین بن بہاء الدین جون پور کے اکابر مشائخ اور مشاہیر اولیاء میں ہیں اور مخدوم عیسیٰ تاج کے نام سے مشہور ہیں، شیخ عبدالحق دہلوی نے آپ کی نسبت لکھا ہے ھو ممن یتفق علی ولایتہ

وعظمتہ شیخ فتح اللہ اودھی کے خلیفہ راستیں اور ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے شاگرد رشید تھے، یادِ حق میں بالکلیہ مستغرق اور دنیا و اہل دنیا سے قطعی بے نیاز تھے، بادشاہ وقت نے نذر دینا چاہی تو قبول نہ فرمایا اور یہ رباعی پڑھی۔

من دلق خود بہ اطلس شاہاں نمی دہم　　　من فقر خود بہ ملک سلیماں نمی دہم
از رنج فقر در دل گنجے کہ یافتم　　　ایں رنج را بہ راحت شاہاں نمی دہم

(ترجمہ: میں اپنی گدڑی کو بادشاہوں کے ریشمی لباس کے عوض نہیں دے سکتا، میں اپنے فقر سے ملک سلیمان کے بدلے دستبردار نہیں ہوسکتا، میں نے درد فقیری کی وجہ سے دل میں جو خزانہ پایا ہے اس کو بادشاہوں کی راحت کے عوض نہیں بیچ سکتا)

آپ کے فقر و درویشی کا یہ پایہ تھا کہ گھر میں چراغ بھی نہ جلاتے تھے، استغراق کی یہ کیفیت تھی کہ حجرے کے دروازے پر ایک درخت تھا مگر ان کو اس کی خبر نہ تھی، ایک مرتبہ ان کی جائے نشست پر پتیاں پڑی ہوئی تھیں تو پوچھا یہ پتیاں کہاں سے آگئیں اس وقت لوگوں نے بتایا تو ان کو معلوم ہوا کہ یہاں کوئی درخت بھی ہے، مخدوم کے دادا پردادا بھی اہل اللہ میں سے تھے، ان کے مزارات دہلی میں ہیں۔ آپ اور آپ کے چھوٹے بھائی احمد عیسیٰ لڑکپن میں اپنے والد قاضی عیسیٰ خلیفۂ دوم مخدوم جہانیاں کے ساتھ دہلی سے جون پور آئے، قاضی عیسیٰؒ اور مخدوم صاحبؒ جون پور میں مدفون ہیں اور احمد عیسیٰ اپنے برادر بزرگ سے خلافت حاصل کر کے بہار چلے گئے اور وہاں اپنا فیض جاری کیا اور وہیں مدفون ہوئے، حضرت مخدوم کی وفات ۸۷۰ھ میں ہوئی۔ (معارف ص: ۳۷۲، ماہ نومبر ۱۹۵۴ء، جلد نمبر ۷۴۔ خاندانی بیاض مولانا عبدالقدوس رومؔی کے پاس موجود ہے، جو نہایت مستند ہے، مولانا موصوف اسے بڑی دیدہ ریزی اور تحقیق کے ساتھ مرتب کر رہے ہیں، اس میں نسب کی تمام تفصیلات موجود ہیں۔)

صوبہ میاں:

مچھلی شہر میں ایک ذی علم بزرگ جناب مولوی عبدالحق صاحب عرف صوبہ میاں تھے، اللہ تعالیٰ نے صاحب حیثیت بھی بنایا تھا یہ حضرت مخدوم عیسیٰ تاج کی نسل میں تھے، صوبہ میاں کے دو فرزند تھے، فضل حق اور حفیظ الحق۔

مولوی دادا:

ایک روز صوبہ میاں نے مچھلی شہر کی ایک مسجد میں دیکھا کہ ایک اجنبی آیا ہوا ہے جو صورت سے طالب علم معلوم ہوتا تھا، انھوں نے نام و پتہ دریافت کیا مسافر نے اپنا نام احمد محمدی بتایا، صوبہ میاں انھیں اپنے گھر لے آئے اور ان کو تعلیم و تربیت دینے لگے، یہ نو وارد صوبہ میاں کے گھر کے ایک فرد بن گئے، انھوں نے اپنے وطن کا پتہ نشان کسی کو نہ دیا اور اب تو وہ مچھلی شہر کے باشندے ہو چکے تھے۔

صوبہ میاں کے دونوں بچے جب تعلیم کی عمر کو پہونچے تو استاذ نے اپنے دونوں فرزندوں کو مولوی محمد احمد محمدی کے حوالے کر دیا، مولوی صاحب دونوں بچوں کے استاذ بھی تھے اور اتالیق بھی، ان دونوں کے ساتھ محلے اور بچے بھی سے ان سے تعلیم حاصل کرنے لگے، مولوی صاحب تمام عمر مجرد رہے، بچوں کی تعلیم و تربیت کا کام حسبۃً للہ کرتے رہے اور صوبہ میاں کی ڈیوڑھی پر ان کے گھر کا ایک فرد بن کر عمر گزار دی، چونکہ عمر طویل پائی تھی اور کئی نسلوں کے استاد رہے اس لئے عرف عام میں مولوی دادا کے نام سے معروف ہوئے۔

مولوی دادا کے ......دونوں شاگرد تعلیم حاصل کر کے اچھے عہدوں پر فائز ہوئے، مولوی حفیظ الحق صاحب وکیل ہو کر حیدرآباد چلے گئے اور وہاں کامیاب وکالت کی، صاحب ثروت ہوئے انھوں نے حج کا ارادہ تو اپنے ساتھ اپنے والد مولوی

عبدالحق عرف صوبہ میاں اور مولوی دادا کو بھی لے گئے، حج کے بعد مکہ مکرمہ ہی میں صوبہ میاں پر فالج کا حملہ ہوا، مولوی حفیظ الحق صاحب تو اپنے والد کو لے کر مکہ مکرمہ سے وطن واپس آ گئے، مگر مولوی دادا وہیں رہ گئے اور چھ سات سال تک متوکلاً علی اللہ وہیں رہ کر حج و زیارت کی سعادت حاصل کرتے رہے، اس کے بعد وہ مچھلی شہر لوٹے، بعد میں جب مولوی فضل حق صاحب کا خاندان الہ آباد منتقل ہوا تو مولوی دادا بھی الہ آباد آ گئے، ان کے ایک شاگرد مولوی محمد مجتبیٰ صاحب وکیل تھے انھوں نے الہ آباد میں ایک عالیشان مکان تعمیر کر لیا تھا، اسی کا ایک کمرہ (۱) مولوی دادا کے لئے خاص کر دیا گیا اسی میں انھوں نے زندگی کی سانسیں پوری کیں، مولوی دادا نے طویل عمر پائی، غالباً ایک سو دس سال عمر ہوئی، ان کا وصال ۱۹۳۰ء کے بعد ہوا ہے۔ الہ آباد میں محلّہ اکبر پور کے قبرستان میں مدفون ہیں۔

مولانا جامؔی صاحب کے چھوٹے بھائی مولانا عبدالقدوس رومی تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ''والد صاحب سے کبھی کبھی ان کا تذکرہ جو کچھ سنا ہے، اس کے مطابق وہ حضرت سید احمد شہید علیہ الرحمۃ کے گروہ کے مجاہدین سے تعلق رکھتے تھے، ۱۸۵۷ء میں جب انگریز، ان مجاہدین کا سراغ لگا رہے تھے تو یہ روپوشی کی کوشش میں مچھلی شہر پہونچ گئے اور صوبہ میاں نے انھیں اپنے گھر پر رکھ لیا، انگریزوں کا خطرہ دل میں ایسا تھا کہ ہم لوگوں کے گھر پر تقریباً پوری عمر ہی گزار دی لیکن اپنی شخصیت و حقیقت پر سے پردہ نہیں اٹھایا''

آگے رومؔی صاحب لکھتے ہیں:

---

(۱) یہ وہی کمرہ ہے جو بعد ماہنامہ ''معرفت حق'' اور ''وصیۃ العرفان'' کا دفتر بنا، اور یہیں سے جامی صاحب نے حضرت مصلح الامتؒ کے علوم و معارف کی نشر و اشاعت کی۔

> ان کے متروکہ سامان میں دوایک کتابیں بھی ہمارے گھر میں عرصہ تک رہیں پھر والد صاحب نے میرے ذریعہ سے مظاہر علوم کے کتب خانے میں جمع کرادیں ایک کتاب ’’بلوغ المرام‘‘ تھی دوسری شاید ’’نخبۃ الفکر‘‘ تھی، ان کتابوں پر نام مجھے یاد پڑتا ہے کہ احمد محمدی کے بجائے محمد احمدی لکھا تھا اور میرے نزدیک سید صاحبؒ سے تعلق کی بناء پر قرین قیاس بھی یہی ہے اور یہ بھی یاد پڑتا ہے کہ مظاہر علوم میں اس کی رسید دینے والوں نے نام پڑھ کر احمدی ہونے پر تعجب کا بھی اظہار کیا تھا، کیونکہ اس وقت احمدی کی نسبت قادیانیوں کے لئے معروف تھی چنانچہ میں نے صفائی میں یہی کہا تھا کہ یہ نسبت سید احمد شہید کی طرف ہے‘‘

مولوی فضل حق:

صوبہ میاں کے بڑے فرزند مولوی فضل حق صاحب تھے، یہ تعلیم سے فارغ ہوکر سرکاری ملازم ہو گئے تھے ملازمت کے دوران ان کا قیام مختلف شہروں میں رہا کچھ دنوں فرخ آباد میں رہے، اسی دوران دارالعلوم دیوبند کے مشہور استاذ حضرت مولانا عبدالاحد صاحب علیہ الرحمۃ کے والد محترم مولانا عبدالسمیع صاحب فرخ آباد کی جامع مسجد میں امام وخطیب بن کر آئے، مولوی فضل حق نے ملازمت کے ساتھ ان سے عربی بھی پڑھی، تجوید وقرأت اس زمانہ کے مشہور امام فن حضرت قاری عبدالرحمٰن صاحب مکی سے پڑھی، بہت خوش الحان تھے ان کی برکت سے ان کی اولاد میں بھی قرآن عمدہ پڑھنے کا سلسلہ رہا۔ مولوی فضل حق کا وصال ۱۹۲۴ء میں ہوا۔

مولوی سراج الحق صاحب مچھلی شہریؒ :

مولوی فضل حق صاحب کے پانچ فرزند ہوئے ان میں نامور مولانا محمد سراج

الحق صاحبؒ ہوئے۔

مولانا محمد سراج الحق صاحب کی ولادت یکم مارچ ۱۹۰۱ء کو متھرا شہر کے گئوگھاٹ میں ہوئی، جہاں ان کے والد ماجد کلکٹری متھرا میں سپرنٹنڈنٹ تھے، ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی، بعد میں مولوی فضل حق آگرہ آگئے تھے وہاں ایک اسکول میں عربی زبان کی تعلیم حاصل کی۔

چونکہ مولوی فضل حق صاحب مولانا عبدالسمیع صاحب دیوبندی کے شاگرد رہ چکے تھے اسی مناسبت سے مولوی صاحب موصوف نے اپنے ذہین اور ہونہار بچے کو کمسنی میں ہی یعنی صرف بارہ برس کی عمر میں دیوبند بھیج دیا، وہاں وہ مولانا عبدالسمیع صاحب کے مکان پر مقیم رہے مگر طبیعت نہیں لگی، اس لئے واپس والد صاحب کی خدمت میں آگئے اور آگرہ ہی میں مدرسہ عالیہ جامع مسجد میں عربی وفارسی کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔

تعلیم کی تکمیل مدرسہ مصباح العلوم الہ آباد سے کی، ۱۹۱۸ء میں فراغت حاصل کی اور وہیں کرنل گنج اسکول میں ملازمت مل گئی، دوایک سال بعد گورنمنٹ کالج الہ آباد میں فارسی وعربی کے استاذ کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوگیا اور جولائی ۱۹۵۱ء میں بحیثیت لکچرار اسی کالج سے پنشن لے کر سبکدوش ہوئے۔

مولانا سراج الحق صاحبؒ ایک صاحب نظر عالم اور صاحب نسبت بزرگ تھے، بیعت کا تعلق ابتداء حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ سے ہوا، گاہے گاہے تھانہ بھون حاضری دیتے رہے اور مراسلات بھی جاری رہی، حضرت تھانوی کے فیضان نظر اور صحبت کیمیا اثر سے دینی رنگ خوب چڑھ گیا تھا۔

حضرتؒ کے وصال کے بعد ان کے برگزیدہ خلیفہ حضرت مولانا شاہ محمد عیسیٰ صاحبؒ الہ آبادی کی طرف رجوع کیا، حضرت مولانا الہ آبادی ہی نے انھیں تھانہ بھون

پہونچا دیا تھا، اب باقاعدہ انھیں سے بیعت ہوگئے لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد ۱۹۴۴ء میں وہ وفات پاگئے تو آخر دینی ذوق ورجحان اور روحانیت کی تلاش وجستجو نے انھیں فتح پورتال نرجا ضلع اعظم گڑھ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کی خدمت میں پہونچادیا اور وہیں کے ہوکر رہ گئے، اور جلد ہی وہاں سے خلافت سے سرفراز ہوگئے مگر غالباً انھوں نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا اور نہ کسی کو بیعت کیا۔

مولانا سراج الحق صاحبؒ نے چونکہ عرصۂ دراز تک گورنمنٹ کالج میں پڑھایا ہے اس لئے انھیں جدید تعلیم یافتہ حضرات سے خوب سابقہ رہا، ان کے احوال، ان کے ذوق اور ان کی دین سے عموماً دوری کو خوب دیکھتے رہے اس کے علاوہ الہ آباد میں عوام سے قریب رہ کر ان کے حالات کا بھی خوب اندازہ لگایا، اس وقت الہ آباد بدعات کا گہوارہ تھا، مولانا کے دل میں ایک جوش تھا ایک تڑپ تھی کہ مسلمانوں کے درمیان سے جہالت دور ہو، بدعات کا خاتمہ ہو، نئی نسل کی بے راہ روی ختم ہو وہ خود بزرگوں کے یہاں سے کسب فیض کرتے اور پھر اسے عام مسلمانوں میں لٹاتے اور پھیلاتے۔ الہ آباد میں اس کیلئے انھوں نے درس قرآن کا سلسلہ جاری کیا، قرآن کی تفسیر بیان کرتے، لوگوں کے درمیان حقیقی دین پیش کرتے، عقائد کی اصلاح کرتے، اعمال صالحہ کی طرف متوجہ کرتے اور اس کے لئے شب وروز محنتیں کرتے اور اس سلسلہ میں کسی مداہنت کے روادار نہ ہوتے، شادی بیاہ کی مہمل اور مسرفانہ رسوم کے خلاف قولاً بھی اور عملاً بھی جہاد کرتے۔ (اس سلسلہ میں ان کی کتاب ''معمولات نبوی'' مشہور ومعروف ہے)

یہی جذبہ اصلاح تھا اور قرآن کریم سے غیر معمولی دلچسپی تھی کہ انھوں نے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو قرآن کریم کے انگریزی ترجمہ کی طرف متوجہ کیا، مولانا دریابادی ۱۹۳۳ء میں طویل قیام کیلئے تھانہ بھون حاضر ہوئے اس وقت جن حضرات سے تھانہ بھون مین ملاقاتیں ہوئیں ان کا ذکر کرتے ہوئے ''حکیم الامت'' میں لکھتے ہیں:

’’ملاقات تو اور حضرات سے بھی ہوئی سب نہ اب یاد ہیں اور نہ سب کا ذکر ہی ضروری ہے، لیکن ایک صاحب سے تو بہر حال ملتے چلئے، جوان عمر آدمی چہرے پر نرمی اور اسی کے متناسب ریشم کے سے ملائم چھوٹی سی ڈاڑھی کے بال شرمیلے، کم سخن، الہ آباد کے انگریزی اسکول میں فارسی کے استاذ، ذہین، سخن فہم، اقبال کے مداح اور شیدائی، خانقاہ کے رنگ سے ذرا الگ تھلگ، مہذب، شائستہ، مجھ سے بڑھ کر ملے اور برابر ملتے رہے ان کی ملاقات کی کیا اہمیت تھی یہ کسی قدر انتظار کے بعد آپ پر خود واضح ہو جائے گا‘‘۔

پھر قدرے انتظار کے بعد لکھتے ہیں:

’’بڑی سخت ضرورت ہے اہل سنت کی طرف سے ایک انگریزی ترجمۃ القرآن کی‘‘ ’’پھر آپ ہی کیوں نہیں اس کام کو شروع کر دیتے‘‘

’’اللہ پر بھروسہ کر کے شروع تو کیجئے، دشواریاں حل ہوتی جائیں گی‘‘

’’ترجمہ بالکل نیا نہ ہو نہ سہی، موجود ترجمے جو انگریزی میں ہیں ان ہی میں ترمیم و تنسیخ سے کام لیجئے، محمد علی لاہوری کا ترجمہ انگریزی مترجمین سے تو بہر حال غنیمت ہے، اسی کو زمین بنا کر اس میں کاٹ چھانٹ کر دینا کافی نہ ہوگا؟‘‘

’’آپ ہمت تو کیجئے‘‘

’’شاید شروع نومبر غالباً آخر اکتوبر کی کوئی تاریخ تھی جب تھانہ بھون میں ایک کہنے والے نے مسلسل یہ افسون کان میں پھونکنا شروع کیا، یہ کہنے والا کون تھا؟............مولوی حاجی سراج الحق مچھلی شہری استاذ فارسی گورنمنٹ کالج الہ آباد کا شمار اب بھی مشاہیر میں نہیں ہے، اس وقت تو بیچارے بالکل گمنام تھے لیکن اخلاص محض سے مشورہ دینے والوں کو اپنی ناموری و گمنامی کی پرواہ ہی کب ہوتی ہے۔ ادھر سے یکسر اصرار اور ادھر سے اپنی نا اہلی کی بنا پر قطعی انکار برابر

> جاری رہا اور اسی پر گفتگو ختم ہوگئی۔
>
> بات ختم کہاں ہوئی ان کی زبان تو بیشک خاموش کردی لیکن اپنے دل میں خلش برابر جاری رہی، شروع ہی نہ کردوں؟ کوشش کرنے میں کیا مضائقہ ہے بطور آزمائش پارہ آدھ پارہ کا تو کر ہی ڈالوں............ یہ خیالات تھے اور ان کی الٹ پلٹ، ذکر تو اور بھی بعض صاحب اور نسبۃً زبردست شخصیتیں رکھنے والے صاحب پہلے کر چکے تھے، کبھی ذرا بھی اسے قابل اعتنا نہ سمجھا تھا اب کی یہ فرمائش کس منھ اور زبان سے نکلی ہے کہ دل سے نکالے نہیں نکلتی کھٹک ہے کہ برابر ہوئے جاتی ہے"۔ (حکیم الامت ص ۳۱۷)

ایک مخلص کی بات تھی دل میں اثر کرگئی، آخر وہ کھٹک دل سے نکلی مگر کب جب مولانا دریابادی کے قلم سے ترجمہ قرآن نکل چکا، اس ترغیب وتحریص میں وہی جذبہ کام کر رہا تھا کہ کسی طرح نئی نسل تک دین کا صحیح پیغام پہونچ جائے۔

مولانا سراج الحق صاحب کا دوسرا ذوق جو ان کی تمام زندگی پر چھایا رہا رد شیعیت کا تھا، اس باب میں مولانا کو بہت انہماک تھا، رد شیعیت پر ان کی متعدد تصنیفات ہیں اس سلسلہ میں "فبھت الذی کفر" تحفہ کربلا، اہل بیت واہل سنت، سیرت حضرت زین العابدین مولانا مودودی اور سیدنا عثمانؓ قابل ذکر ہیں۔

مولانا کو درس وتدریس کا بھی ذوق آخر تک رہا، چنانچہ حیات کے آخری ایام میں چند اسباق مدرسہ وصیۃ العلوم الہ آباد میں پڑھاتے رہے، بہت رقیق القلب تھے، نبی کریم ﷺ صحابہ کرام اور بزرگان دین کے واقعات سے بہت متأثر ہوتے تھے، سبق کے دوران ان حضرات کے حالات وواقعات آجاتے تو بے اختیار رونے لگتے ہچکی بندھ جاتی، اللہ کے نام کی حلاوت ولذت سے دل پر کیف تھا اس لئے ذرا سا اشارہ پاکر اور ادنیٰ سی تحریک سے آنکھوں کے راستے برسنا شروع ہوجاتا۔

میں مولانا سے ملا ہوں کوئی طویل صحبت نصیب نہیں ہوئی، مولانا مرحوم یوں تو ہر لحاظ سے خوش نصیب تھے مگر خصوصیت سے اولاد کے باب میں نہایت خوش بخت تھے مولانا کے چار صاحبزادے ہوئے، مولانا عبدالرحمان جامی (صاحب تذکرہ) مولانا عبدالقدوس رومیؔ، حافظ عبدالعزیز سعدیؔ اور مولانا عبدالعلیم عیسیٰ، یہ چاروں صاحب علم، دیندار، متقی و پرہیزگار اور والدین کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھے، کسی نے مولانا مرحوم سے پوچھا تھا کہ اولاد کے باب میں آپ جیسا نصیبہ ور شاید ہی کوئی ہو اس کی وجہ کیا ہے؟ فرمایا یہ تو اللہ کا فضل ہے لیکن میرا جب سے نکاح ہوا ہے میں برابر قرآن کی تعلیم فرمودہ دعا مانگتا رہا ہوں رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا (اے ہمارے رب ہمیں ہماری بیویوں اور ہماری اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب فرما اور ہم کو متقیوں کا پیشوا بنا) شاید اسی کی برکت ہو کہ اولاد سب متقی اور دیندار رہے۔

مولانا کا وصال ۲؍ جون ۱۹۷۷ء کو ہوا، اس سے ایک ڈیڑھ ماہ قبل وہ فجر کی نماز سے پہلے اپنی رہائش گاہ سے کسی قدر فاصلہ پر کسی مسجد میں درس قرآن کیلئے جا رہے تھے کہ پھسل کر گر گئے اور کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی، آخرکار یہی حادثہ جان لیوا ثابت ہوا۔

جس دن مولانا کا وصال ہوا اتفاق سے میں الہ آباد میں موجود تھا، نماز جنازہ اور تدفین میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی بعد نماز عشاء تدفین ہوئی تھی، اس سے فراغت کے بعد مولانا کے صاحبزادگان نے لوگوں سے کہا کہ آپ حضرات تشریف لیجائیں، بعد نماز عشاء والد محترم کچھ وظائف اور دعائیں پڑھا کرتے تھے ہم لوگ چاہتے ہیں کہ قبر پر وہ دعائیں پڑھیں شاید ان کی روح کو تسکین ہو۔

چاروں صاحبزادگان ماشاء اللہ، سبحان اللہ، سب نہایت خوبصورت اور وجیہ چہرے پر نور ایمان کی شعاعیں پھوٹتی ہوئی، سفید برق لباس میں ایسے لگتے تھے جیسے چار

فرشتے زمین پر اتر آئے ہوں، اور محسوس ہورہا تھا کہ قبر پر رحمت کی چادر تنی ہوئی ہو، لوگ واپس ہورہے تھے اور بار بار مڑکر دیکھ رہے تھے، میں ایک کونے میں دبکا یہ منظر دیکھنے لگا، ایک آدمی میرے پاس سے گذرتا ہوا دوسرے سے کہہ رہا تھا، خوش نصیب لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے بیٹے معلوم ہوتے ہیں آدمی نہیں ملائکہ ہوں۔

حق تعالیٰ اپنی رحمت نازل فرمائے، مولاناؒ کی زندگی سراپا دینی جد وجہد اور ہمہ وقت ایمانی واحسانی تگ ودو سے عبارت تھی ان کی زندگی میں بڑا سبق ہے، وہ مستقل ایک کتاب کے موضوع ہیں ان چند سطروں سے ان کا کچھ بھی حق ادا نہیں ہوسکا ہے۔

◆ ◆ ◆ ◆ ◆

باب ۳

مولانا عبدالرحمٰن جامیؔ

اوپر ذکر آیا ہے کہ مولانا سراج الحق صاحبؒ کے چار صاحبزادے ہوئے، ان میں بڑے مولانا عبدالرحمان جامیؔ تھے ان کی وفات ہوچکی، انھیں کی یاد میں یہ سطریں تحریر کی جارہی ہیں، باقی تینوں بقید حیات ہیں اللہ تعالیٰ ان کی عمروں میں برکت دے۔

ولادت:

مولانا جامیؔ صاحب کی ولادت ۲۴/ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۷ھ مطابق ۲۶/ فروری ۱۹۱۹ء بروز چہار شنبہ آبائی وطن مچھلی شہر میں ہوئی، اس وقت تک خاندان مچھلی شہر ہی میں مقیم تھا لیکن اس کے تھوڑے دنوں بعد یہ خاندان الہ آباد منتقل ہوگیا جیسا کہ مولوی عبدالقدوس رومیؔ خبر دیتے ہیں:

> ”میری پیدائش ۱۹/ مئی ۱۹۲۳ء کو الہ آباد میں ہوئی یعنی ۱۹۱۹ء تک مچھلی شہر کی سکونت ترک نہیں ہوئی تھی اور ۱۹۲۳ء میں وہاں کی سکونت ترک ہوچکی تھی، یہ سکونت اندازہ ہے کہ ۱۹۱۹ء میں یا زیادہ سے زیادہ ایک آدھ سال بعد ہی ترک کردی گئی تھی“

جامیؔ صاحب کے بچپن کی کچھ مدت مچھلی شہر میں گزری ہے، مولوی دادا اس

وقت موجود تھے وہ جامی صاحب کو از راہ شفقت گود میں کھلاتے اور بہلاتے تھے، کبھی مزاحاً فرماتے ان کو نہ کھلائیں تو پھر خود روٹی کیسے کھائیں، ان کی ماں روٹی پکا رہی ہیں اس لئے انھیں کھلانا پڑ رہا ہے۔

ایک باخدا بزرگ کی آغوش شفقت میں کھیلنے والا بچہ جو اس کی نگاہ محبت کا مرکز بنا، اس کی دعائیں اس نے حاصل کیں، اس کی سعادت وخوش بختی کا کیا کہنا؟

تعلیم:

جامی صاحب کی ابتدائی تعلیم کہاں ہوئی اس کا سراغ نہ مل سکا، غالب گمان ہے کہ دستور کے مطابق گھر ہی تعلیم کا آغاز ہوا ہوگا اور کیا عجب ان کی تعلیم بھی مولوی دادا کے ہاتھوں شروع ہوئی ہو، مولانا رومؔی اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں:۔

> ’’مجھے جب کچھ شعور ہوا تو انھیں والد صاحب کے اسکول کا طالب علم پایا، گھر پر کبھی کبھی اسکول کے ماسٹروں کا ذکر ان سے سنتا تھا، والد نے انھیں اس وقت جب کہ ہندی اور سنسکرت کا کوئی رواج نہ تھا دوسری زبان سنسکرت ہی دلوائی تھی اور یہ گھر پر ک، کھ، گ، گھ، انگ وغیرہ یاد کیا کرتے تھے‘‘

جن دنوں جامی صاحب اسکول میں پڑھ رہے تھے اس وقت حضرت تھانویؒ کے نامور خلیفہ حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب بھی گورنمنٹ کالج میں عربی کے پروفیسر تھے، مولانا سراج الحق صاحب ان کی خدمت میں عقیدت مندانہ حاضر ہوتے تھے اور ان کے واسطے سے حضرت تھانوی سے مراسلت کا آغاز ہو چکا تھا۔

اسکول سے مدرسہ:

جامؔی صاحب سے میں نے براہ راست بھی یہ واقعہ سنا ہے اور متعدد بار سنا ہے اور اب رومی صاحب بھی اس کی اطلاع دیتے ہیں کہ:

> ’’اسی دور میں کسی موقع پر والد صاحب نے حضرت حکیم الامت علیہ الرحمۃ کو خط میں یہ اطلاع دی تھی کہ میرے دو لڑکے ہیں (اس وقت تک ہم دو ہی بھائی تھے) ایک کو انگریزی پڑھا رہا ہوں، دوسرا قرآن مجید حفظ کر رہا ہے اسے عربی پڑھانے کا ارادہ ہے، حضرت نے اپنے معمول کے مطابق اسی خط پر یہ سوال کرلیا کہ جسے انگریزی پڑھا رہے ہیں اس کے دین کی حفاظت کیلئے کیا سوچا ہے؟‘‘

اس خط نے جامیؔ صاحب کی زندگی کو ایک نیا مبارک اور خوشگوار موڑ دیا، ورنہ جس کو آج ہم مولانا عبدالرحمان جامی صاحب کے پر تقدس نام سے یاد کرتے ہیں حضرت مولانا شاہ وصی اللہ قدس سرہٗ کے علوم ومعارف کے امین ومحافظ اور شارح وترجمان کی حیثیت سے پہچانتے ہیں، ایک اعلیٰ درجہ کے عالم دین، مفتی شرع متین اور صاحب نسبت بزرگ سمجھتے ہیں انگریزی پڑھ کر خدا جانے کیا ہوتا، نہ جانے دین سے لگاؤ ہوتا یا بہت سے انگریزی خوانوں کی طرح دین سے بیگانہ ہوکر دنیاداری کے گندے سمندر میں غرق ہوجاتا۔

حضرت تھانویؒ کا گرامی نامہ ملنا تھا کہ والد صاحب نے بے تامل اور بغیر کسی تاخیر کے ان کو اسکول سے اٹھالیا، واقعی شیخ کی اطاعت ہو تو ایسی ہو، یقین ہے کہ والد ماجد نے انگریزی میں جو لگایا تھا اس میں دینی خدمت کا ہی جذبہ رہا ہوگا لیکن حضرت تھانویؒ کے خط سے جب دینی ضرر کا احساس ہوا تو کوئی تاویل نہیں کی کوئی بات بنانے کی کوشش نہیں، اطاعت کی اور دم نقد اطاعت کی، جامیؔ صاحب اس وقت آٹھویں کلاس میں پڑھ رہے تھے درمیان سال تھا مگر یک لخت تعلیم ترک کرادی، دوستوں اور ہمدردوں نے مشورے دیئے کہ آٹھواں درجہ پاس کر لینے دیجئے تاکہ اس کی سند حاصل رہے مگر جس نے شیخ کی اطاعت کو اپنا سب سے قیمتی سرمایہ سمجھا اس نے اس

مشورہ کو تسلیم کرنا اطاعت کے منافی گردانا، پھر کیا ضمانت تھی کہ آٹھویں کے بعد نویں اور دسویں کا مشورہ نہ دیا جاتا، بہر حال انگریزی تعلیم چھڑا دی گئی۔

عربی تعلیم:

اس وقت الہ آباد میں دائرہ شاہ عبدالجلیل چک میں ایک عربی مدرسہ تھا، مدرسہ اشرفیہ جسے حضرت تھانوی کے نام سے منسوب کر کے حضرت کے معتقد اور متوسل خان بہادر عبدالباقی خاں نے قائم کیا تھا، اس مدرسہ میں اس وقت مولانا محمد ابراہیم صاحب کیرانوی علیہ الرحمۃ پڑھاتے تھے، جامی صاحب کا اس مدرسہ میں داخلہ کرادیا گیا اور عربی تعلیم شروع ہوگئی، کچھ دنوں کے بعد مولانا محمد ابراہیم چلے گئے پھر ایک دوسرے مدرس تشریف لائے، مگر پھر وہ بھی زیادہ دنوں نہیں ٹھہرے ان کے بعد مولانا سید حامد حسن امروہوی تشریف لائے، ان حضرات سے جامی صاحب نے کافیہ قدروی تک تعلیم حاصل کی۔

ایک خاص رنگ:

مولانا جامی کو ابتداء ہی سے بزرگوں کے ساتھ خاص تعلق اور عقیدت رہی ہے اور اللہ والوں کی نظر عنایت بھی خصوصیت کے ساتھ ان پر رہی ہے، حسن اتفاق کہ دور طالب علمی میں از راہ سعادت مندی اپنے اکابر کو جو خطوط لکھے ہیں اور انھوں نے جو دعائیں دی ہیں ان کا ریکارڈ محفوظ ہے، ان خطوط کو موقع بہ موقع نقل کر دینا نامناسب نہ ہوگا، ان سے مولانا کی رفتار تعلیم ان کے مزاج طالب علمی اور افتاد طبع کا پتہ چلتا ہے، اور ہوسکتا ہے آج جب کہ طلبۂ علوم دین پر بھی خودرائی اور آزادی کا دورہ پڑتا ہے اور بڑھتا چلا جارہا ہے ممکن اس سے طالب علموں کو کچھ نفع ہو۔

انگریزی چھڑانے کے بعد غالباً والد ماجد ہی نے عربی کی تمہیدات شروع

کرادی تھی، حضرت مولانا شاہ محمد عیسیٰ صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں اور یہ پہلا خط ہے جو انھوں نے اپنے شیخ ومربی کو لکھا ہے:

”حضرت مخدومی ومولائی۔ السلام علیکم۔

میں نے پہلے اوجز السیر پڑھا، اس کے بعد بہشتی زیور پڑھنا شروع کیا، اس کے ساتھ ہی ساتھ تعلیم الدین اور اصلاح الرسوم بھی ختم کر چکا تھا، اب فارسی شروع کی ہے، فقرات محمودیہ پڑھ رہا ہوں، ترجمہ قرآن شریف کا بھی شروع کر دیا ہے، جناب کی خدمت میں دعاء کے واسطے عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے عالم باعمل بنائیں اور اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ فقط

عبدالرحمٰن (جامی)“

جواب :......تمہارے لئے تو خود دعا نکلتی ہے بلا تمہاری درخواست کے جب میں تمھیں دیکھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ علم وعمل میں برکت روزافزوں فرمائیں۔“

ایک طالب علم جو انگریزی ترک کر کے عربی کی طرف آیا ہے اس پر کس قدر شفقت کی نظر ہے، بزرگوں کی دعائیں خالی جانے والی نہیں ہوتیں۔

حضرت تھانویؒ کی خدمت میں عریضہ:

اسی دور کا ایک عریضہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے نام بھی ملتا ہے، مراسلت کی طرح جامی صاحب نے اسی وقت ڈال دی تھی، سہارن پور پہونچنے کے بعد مزید خط وکتابت ہوتی رہی، پہلے خط کا متن حسب ذیل ہے، یاد رہے کہ خط اس وقت لکھا گیا ہے جب کہ جامی صاحب عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھ رہے تھے۔

از مدرسہ عربیہ اشرفیہ چک الہ آباد

۸/رجب ۱۳۵۵ھ

سیدی وسندی وسیلۃ یومی وغدی حضرت مولانا دامت برکاتہم

بعد سلام مسنون بصد ادب گزارش ہے کہ احقر اب سے دو سال پہلے انگریزی تعلیم اسی اسکول میں جس میں حضرت سیدی جناب مولانا عیسیٰ صاحب مدظلہ العالی ونیز والد جناب مولوی سراج الحق صاحب مدرس ہیں، پاتا رہا،

جناب سیدی مولوی محمد عیسیٰ صاحب کے ارشاد سے والد صاحب نے انگریزی تو اسی وقت چھڑادی تھی اس کے بعد بہشتی زیور، اصلاح الرسوم، اوجزالسیر اور تعلیم الدین وغیرہ تقریباً ایک سال سے مدرسہ اشرفیہ الہ آباد میں عربی پڑھ رہا ہوں، اس وقت کافیہ قدوری، قلیوبی، قال اقول درس میں ہے اور اب بفضلہ تعالیٰ عربی تعلیم میں انگریزی کی بہ نسبت طبیعت زیادہ لگتی ہوئی پاتا ہوں، جناب سے درخواست ہے کہ میرے لئے دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ علم وعمل میں روزافزوں ترقی اور طبیعت میں استقامت نصیب فرمائیں۔ فقط

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

خادم عبدالرحمٰن

جواب: دل سے دعا کرتا ہوں

جن دنوں مدرسہ اشرفیہ الہ آباد میں زیر تعلیم تھے اور حضرت مولانا حامد حسن امروہوی سے تعلیم حاصل کر رہے تھے، بعض وجوہ واسباب سے مولانا نے یہاں کا تعلق ترک کر دیا تھا، اس دوران مولانا جامی صاحب نے انھیں ایک عریضہ لکھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اپنے اساتذہ سے کیسا لگاؤ تھا یہ خط ۱۳۵۶ھ کو لکھا گیا ہے۔

”سیدی ومحترمی واستاذی حضرت مولوی صاحب دامت برکاتہم وفیوضہم

بعد سلام مسنون بصد تعظیم گزارش ہے کہ میں نے جناب سے عرض کیا تھا کہ میں ان شاء اللہ جناب کو دعاء کے لئے وقتاً فوقتاً یاد دلاتا رہوں گا گویا میں نے

ایک قسم کا وعدہ کرلیا تھا اور اب تک اس کے وفا کرنے سے قاصر رہا جس کا مجھے سخت افسوس ہے اور اپنی اس غلطی کی معافی چاہتا ہوں۔

جواب:......عزیزم مولوی عبدالرحمٰن سلمہ الرحمٰن

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

خیریت نامہ ملا اس محبت پر دل سے دعاء نکلی، میں اس لائق کہاں ہوں خود خطاوار ہوں، پُر از معاصی ہوں، دعا کا طالب ہوں۔"

خط: جناب کے جانے کی وجہ سے مجھے دو صدمے پیش آئے، ایک تو سبق کا ناغہ دوسرے جناب کی جدائی، پہلا تو الحمدللہ رفع ہوگیا، دوسرا یعنی جناب سے ملاقات اس کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

جواب: اگر صادق محبت ہے تو اللہ تعالیٰ آسان فرمائیں گے۔

خط: میرا ارادہ شوال میں ان شاء اللہ سہارن پور جانے کا ہے، شوال میں ان شاء اللہ چلا جاؤں گا۔

جواب: اللہ تعالیٰ ارادہ کو پورا فرمادیں۔

خط: جناب سے نہایت ادب سے گزارش ہے کہ میرے لئے دعاء فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ علم وعمل میں روز افزوں ترقی عطا فرمائے اور طبیعت میں استقامت دے، نیز آفات ارضی وسماوی سے محفوظ رکھے۔ آمین

جواب: سب مقاصد کے لئے دعا کرتا ہوں اور طالب دعاء ہوں، پرسان حال کو سلام، اپنے والد صاحب کو بھی سلام کہئے۔

◆ ◆ ◆ ◆ ◆

باب ۴

مظاہر علوم میں

جامی صاحب حسب ارادہ شوال ۱۳۵۶ھ میں سہارن پور مدرسہ مظاہر علوم تشریف لے گئے، وہاں بسہولت داخلہ ہوگیا، اس وقت مدارس میں آج کل کی طرح جماعتوں اور درجوں کی جکڑ بندی نہ تھی نہ طلبہ پر کتابوں کا انبار لادا جاتا تھا، طالب علم کے لئے جو کتاب مناسب ہوتی اہل مدرسہ تجویز کردیتے، اس کی اطلاع دیتے ہوئے اپنے مربی مولانا محمد عیسیٰ صاحب کو لکھتے ہیں کہ:۔

خط: امسال سہارن پور حاضر ہوکر مدرسہ عربیہ مظاہر علوم میں داخل ہوگیا ہوں۔

جواب: یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی۔

خط: شرح جامی بحث اسم، کنز الدقائق، قطبی، اصول الشاشی یہ چار کتابیں تجویز ہوئی ہیں، یوں تو بفضلہٖ تعالیٰ پڑھنے میں طبیعت لگ گئی ہے جناب سے بصد ادب گزارش ہے کہ احقر کے لئے دعائے خیر فرمائیں اللہ تعالیٰ علم وعمل میں روز افزوں ترقی اور اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

جواب: دل وجان سے دعاء ہے۔

یہ سال جامعہ مظاہر علوم میں باطمینان گزرا، جامی صاحب بالکل یکسو ہوکر حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب علیہ الرحمۃ کی ہدایات کے مطابق وہاں تعلیم حاصل

کرتے رہے اور اپنے احوال کی خبر دیتے اور مشورہ لیتے رہے، لیکن یہ وقت وہ تھا جب انگریزوں خلاف آزادی کی سیاسی تحریکات خوب شباب پر تھیں تمام ملک میں ایک ہی نعرہ گونج رہا تھا کہ انگریز ہندوستان چھوڑ دیں، ملک کا کوئی ادارہ ایسا نہیں تھا جہاں اس کی گونج نہ سنائی دیتی رہی ہو، علماء و اساتذہ مدارس میں، مشائخ و صوفیہ خانقاہوں میں، واعظین و مقررین جلسہ گاہوں میں، شعراء مشاعروں میں، غرض جو جہاں تھا کسی نہ کسی درجہ میں اس سے متاثر تھا، مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور ان سب معاملات سے بظاہر یکسو دینی تعلیم و تربیت میں سرگرم کار تھا لیکن وقت کی گرم گرم ہوائیں اس پرسکون ماحول کو بھی کبھی گرما جاتی تھیں۔

اسی دوران سہارن پور میں کوئی سیاسی جلسہ ہوا جس میں مظاہر کے کچھ طلباء نے مداخلت کی، جس کے نتیجہ میں شہر میں شورش اور ہنگامہ برپا ہو گیا اور طلبہ بھی مشتعل ہو گئے، اب مدرسہ اس کی زد میں آیا جا رہا تھا، ارباب مدرسہ نے اس موقع پر سرغنہ طلباء کو مدرسہ سے خارج کر دیا، ان کی پشت پناہی کے لئے کچھ سیاسی پارٹیاں اور افراد کھڑے ہو گئے، اندیشہ تھا کہ شوال میں جب نیا تعلیمی سال شروع ہوگا تو یہ طلبہ شورش و ہنگامہ برپا کریں گے اس افراتفری میں تعلیم کا نقصان ہوگا، طلبہ کا مزاج بدلے گا، ابھی اچھا خاصا نقصان ہو چکا ہے اب مزید ہونے کا اندیشہ ہے، حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب طالب علموں کے لئے ان تحریکات میں شرکت کو انتہائی مضر سمجھتے تھے بلکہ تمام علماء ان سیاسی ہلّڑوں سے طلبہ کو بچانا ضروری سمجھتے تھے، طلب علم کا زمانہ بالکل یکسوئی کے ساتھ علمی اشتغال میں بسر ہونا چاہئے تاکہ علم میں رسوخ پیدا ہو، کچ اور ناتمام علم کے ساتھ طالب علم میدان حیات میں اترے گا تو ہر جگہ منھ کی کھائے گا۔ اس لئے اس دور میں دنیاوی ہنگاموں سے دور رہے تو بہتر ہے۔ مولانا الہ آبادیؒ نے خیال کیا کہ یہ شوال میں سہارن پور جائیں گے تو ہو سکتا ہے کہ تعلیم کا نقصان ہو اور ہو سکتا ہے کہ

دوسروں کی تحریک وترغیب سے یہ بھی اس میں کسی درجے میں مبتلا ہوجائیں۔

اس سال مولانا سراج الحق صاحبؒ کا ارادہ تھا کہ اپنے دوسرے فرزند رومیؔ صاحب کو بھی بڑے بھائی کے ساتھ سہارنپور بھیج دیں مگر ان حالات میں مولانا الہ آبادیؒ نے ان دونوں کو سہارنپور جانے سے منع کردیا اور مدرسہ جامع العلوم کانپور میں داخلہ کرادیا۔ اس وقت جامع العلوم کے سرپرست مولاناؒ ہی تھے لیکن کانپور میں جامی صاحب کا جی نہیں لگا، کچھ کتابوں کا بھی مسئلہ تھا کچھ بڑی جگہ سے چھوٹی جگہ آنے کا بھی اثر تھا، کچھ طلبہ سے نامانوسیت تھی اس لئے مولانا محمد عیسیٰ صاحبؒ کی خدمت میں خطوط لکھتے رہے۔

ایک خط مدرسہ میں داخلہ کے چند روز بعد ہی لکھا، پورا خط مولانا کے جواب کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے، اس سے جامی صاحب کی تعلیمی دلچسپی، حسن فہم اور سلامت طبع کا پتہ چلتا ہے لکھتے ہیں،

> معظمی ومحترمی حضرت مولوی صاحب دامت برکاتہم وفیوضہم
>
> السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ
>
> خط اس قدر جلدی لکھنے کی نوبت یوں آئی کہ میں سخت تردد میں پڑگیا ہوں، یہاں ویسے تو قیام وطعام کا انتظام درست ہوگیا ہے لیکن طبیعت گھبراتی ہے کچھ ادھر شروع میں جس وقت اسباق تجویز ہوئے تھے دل نہ لگتا تھا کیونکہ اس میں تعلیمی نقصان تھا، ایک تو یہاں ہدایہ اولین درس میں داخل نہیں ہے۔
>
> **جواب** :......شرح وقایہ اولین کے بعد چنداں ضرورت ہدایہ اولین کی نہیں رہ جاتی، بہتر یہ ہے کہ شرح وقایہ اولین میں شامل ہوجایئے، چنانچہ میں نے ایک لفافہ مہتمم صاحب کی خدمت میں بھیجا تھا اس میں لکھ دیا تھا کہ جامیؔ کو شرح وقایہ اولین میں شامل کرلیا جائے اور سال میں اولین ختم کرادی جائے

تاکہ سال ثانی کے شروع سے ہدایہ آخرین شروع کرادی جائے۔ اگر اسی مدرسہ میں رہنے کی رائے ہو تو مہتمم صاحب سے اس لفافہ کی یاد دہانی کراکر شرح وقایہ اولین شروع کر کے سال کے اندر ختم کی جاوے۔

خط :......دوسرے شرح وقایہ بھی ڈیڑھ حصہ غائب، ثانی وہ بھی قریب قریب نصف آخر میں شرکت ہے، اور دوسری کتابوں کا حال جناب کو بھی معلوم ہے، مثلاً قطبی کا بیکار اعادہ حالانکہ سہارن پور میں سالانہ امتحان میں سب سے زیادہ نمبر اسی قطبی ہی میں آئے تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اسباق میں بھی طبیعت نہیں لگتی سہارن پور کے بعد اس سے مناسبت بھی نہیں۔

جواب:......کیا اسباق اساتذہ سمجھا نہیں سکتے میرے پوچھنے پر تو آپ نے اس کی نفی کی تھی۔

خط :......اسباق شروع ہو گئے ہیں، ان سے چنداں شکایت نہیں لیکن مظاہر علوم کے اسباق میں یہاں سے زیادہ طبیعت لگتی ہوئی پاتا تھا۔

جواب :......وجہ معقول آپ نے لکھا نہیں کہ معقول وجہ کیا ہے طبیعت نہ لگنے کی، تو غور کرتے۔

خط :......خیال تھا کہ اسباق شروع ہو جانے کے بعد شاید طبیعت لگ جائے لیکن وہ غلط ثابت ہوا، ایک اور بات آئندہ کے بارے میں یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ابھی تو ہماری کتاب پھر بھی اوسط ہی کی ہیں آگے اگر خدا کو منظور ہوا تو مشکوٰۃ وجلالین یا دورہ کیلئے بڑی جماعت کی ضرورت ہوتی ہے لوگ بڑے مدارس کو منتقل ہوتے ہیں اس لئے کہ وہاں ہی جانے میں زیادہ فائدہ ہوتا ہے، میرا سلسلہ تو لگا ہی ہوا تھا کوئی دقت نہ ہوتی، رہے میاں رومیؔ ان ہی کا خیال مانع

ہوتا ہے، تو اگر آپ فرمائیں تو حضرت ناظم صاحب سے ان کے داخلہ کے بارے میں جواب منگواؤں، میں وہاں رہتا ہی ہوں ممکن ہے کوئی صورت نکل آوے یا جناب ہی یہاں مہتمم صاحب کو ایک رقعہ لکھ دیں کہ مثل لقمان (حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحبؒ کے صاحبزادے، کانپور میں پڑھتے تھے) ان کی بھی نگرانی خاص طور سے ہے............ یا اگر مناسب ہو تو سہارن پور ہی ان کو بھی لواتا جاؤں کوئی نہ کوئی انتظام ان کے پڑھنے کا خارج از مدرسہ ہو ہی جائے گا۔

جواب :......رومی کو اپنے سے علیحدہ رکھنا تو ہرگز مناسب نہیں ہے جہاں رہئے دونوں ساتھ رہئے۔

خط :......جناب کے پاس میں نے صورت حال عرض کر دی ہے اب اس صورت میں جناب کی کیا رائے ہے ابھی سہارنپور میں پڑھائی کی ابتداء ہی ہے کوئی حرج نہیں ہوگا۔

جواب :......تعجیل نہ کی جائے ایک سال میں یہاں کی تعلیمی حالت اور وہاں کے زہریلے اثرات کا موازنہ ہو جائے گا، اس وقت جیسی رائے ہو عمل کیا جائے۔ زہریلے اثرات کے ہوتے ہوئے ممکن نہیں کہ کوئی طالب علم کتنا فہیم کیوں نہ ہو ان اثرات سے متاثر نہ ہو، تھوڑا سا تعلیمی نقصان اگر ہو تو گوارا ہے لیکن وہ زہریلے اثرات گوارا نہیں، تمھارے اطمینان کے لئے اتنا لکھ دیا باقی اس کو عام تذکرہ میں لانا مناسب نہیں ہے“

حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحبؒ کا یہ مکتوب گویا قطعی حکم ہے کہ سہارنپور نہیں جانا ہے لیکن جامی صاحب یہاں سے اتنے برداشتہ خاطر ہیں اور تعلیمی نقصان اتنا زیادہ محسوس کر رہے ہیں کہ ان کا دل یہاں رہنے کے لئے آمادہ نہیں ہے، ایک طرف بزرگوں کے احکام کی پابندی اور ان کی اطاعت اور دوسری طرف تعلیم کے نقصان کی

وجہ سے وحشت ایک عجیب کشمکش میں مبتلا تھے، اس کشمکش کی منہ بولتی تصویر جامی صاحب کا ایک دوسرا مکتوب ہے جس میں انھوں نے شرح وسط کے ساتھ اپنا مقدمہ بارگاہ عیسوی میں پیش کیا ہے اسے بھی ملاحظہ فرمالیجئے...... لکھتے ہیں:

> ”جناب کا جواب موصول ہوا، اس کے بعد احقر نے لقمان میاں کے خط میں ایک پرچہ لکھ کر رکھ دیا تھا جس میں جناب کے مشورہ کے بموجب سہارن پور جانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا.......... حضرت! مجھے یہاں اسباق سے شکایت نہیں ہے جو کچھ ہوتا ہے بعد المطالعہ سمجھ میں ضرور آجاتا ہے لیکن جو کتابیں پچھلی چھوٹ گئی ہیں ان کی تلافی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، شرح وقایہ اولین میں خیر شریک ہوگیا ہوں لیکن (۱) بعض الاول اور بعض الثانی جو رہی جاتی ہے اس کا کیا حشر ہوگا؟ (۲) نور الانوار بھی نوے صفحے چھوٹ چکے ہیں، حالانکہ نصاب میں یہاں جو تخفیف کی گئی ہے وہ اس شرط پر ہے کہ ساری کتابیں تمت تک ہوں (۳) اب حال یہ ہے کہ بقیہ نور الانوار ۲ ماہ حد ۳ ماہ میں ختم ہو چکے گی، اس کے بعد مشکوٰۃ شریف شروع ہو جائے گی، حضرت ابھی مشکوٰۃ کی استعداد اپنے اندر نہیں معلوم ہوتی، ساتھی اکثر بنگالی ہیں ان کو تو محض ترجمہ ہی کتاب کے اختتام کی سند ہے (۴) کچھ ایسا تعارض پڑ گیا تھا جس سے سہارن پور میں پچھلے سال ادب کی کوئی کتاب نہ ہو سکی اور یہ سال بھی خالی ہے (۵) اب مشکوٰۃ اسی سال شروع ہوگی تو ختم ہونے سے رہی کیونکہ وقت صرف چھ ماہ رہ جاتا ہے لامحالہ آئندہ سال کے ابتدائی چھ ماہ لینے ہونگے، شروع سال کا حساب کتاب ہو ہی نہیں سکتا، جب تک کہ کسی کتاب میں تاخیر نہ کی جاوے یا دوسری اگلی کتاب کو جلد جلد پڑھا کر سال میں ختم کیا جاوے، حالانکہ سہارن پور میں ابھی تیسرے سال میں مشکوٰہ ہے اس سے قبل قبل ادب و منطق وفلسفہ سب کی تکمیل ہو چکے گی۔ (۶) ساتھی جیسا کہ عرض

کرچکا سب بنگالی ہیں، جس کی وجہ سے تکرار میں بھی دقت ہوتی ہے اس سے بہت زیادہ سہولت سہارن پور میں ہوتی تھی چنانچہ گذشتہ سال بعض بعض کتابیں کچی رہ گئیں لیکن قرب امتحان میں تکرار کر کے قابل امتحان کر لیں وجہ یہ کہ ہر قسم کے لڑکے ہوتے ہیں ایک سے ایک ذہین جس کی وجہ سے سہولت بہت ہوتی تھی۔

غرض کہ بجائے طبیعت لگنے کے ان سب باتوں سے گھبراتی ہے آج جس وقت معلوم ہوا کہ نور الانوار کے بعد مشکوٰۃ شریف ہوگی تو ایسی طبیعت پھیکی پڑی کہ کچھ کہنے کو نہیں۔ خیال کیا کہ یا اللہ حال اپنا یہ ہے اور مشکوٰۃ شریف نہ ہوئی تماشہ ہوا، محض ترجمہ سمجھ لینا کافی ہوتا تو اب سے پہلے بھی ممکن تھا۔

اب جناب نے یہ فرمایا تھا کہ آئندہ سال سہارن پور میں امتحان دیدینا، تو عرض یہ ہے کہ وہ تو یہ دیکھیں گے کہ شرح وقایہ ہر دو جلد پوری ہوئی یا نہیں؟ اور یہاں ہر دو ناقص! نور الانوار پوری پڑھی یا نہیں وہ بھی ناقص، اس کے ساتھ کی کتاب مسلم پڑھی یا نہیں، مسلم یہاں داخل نصاب ہی نہیں تو اس صورت میں وہاں داخلہ ممکن ہی نہ ہوگا یا اپنے ساتھیوں سے پیچھے رہنا ہوگا جس کو خیال کر کے شرم معلوم ہوتی ہے۔

جناب نے وہاں کے اثرات سے متاثر ہونے کو لکھا ہے، بالکل بجا ارشاد ہے۔ اللہ کی ذات سے مجھے اپنے اوپر اتنا اعتماد معلوم ہوتا ہے کہ جو لڑکے فتّین یا کسی جمعیۃ وغیرہ کے پابند ہوں ان سے اجتناب کرسکوں، چنانچہ پارسال ہی اس قسم کی حرکتیں شروع ہو چکی تھیں لیکن احقر کو کسی سے کچھ واسطہ نہیں تھا اور اس کو ہمیشہ مدرسہ کی مخالفت پر محمول کرتا تھا حتیٰ کہ جلوس مدرسہ سے نکلا کچھ موافق لڑکے بھی تماشائی کی حیثیت سے گئے تھے میں اس وقت بھی باز رہا۔

بہرحال یہاں کی حالت دیکھ کر طبیعت بہت گھبراتی ہے یہاں تعلیمی

نقصان تھوڑا بہت معلوم ہوتا ہے، دوسرے حضرت مولانا تھانوی مدظلہ العالی سے سال بھر میں دو تین بار ملاقات اور حاضری کا شرف یہ الگ رہا، ابھی وہاں کے ناغہ کی مکافات تکرار وغیرہ سے ہوسکتی ہے کیونکہ شروع سال میں کتابیں بہت تھوڑی ہوتی ہیں۔

اب آخر میں جناب سے درخواست ہے کہ صورت مذکورہ پر غور فرما کر ارشاد فرماویں کہ کون سا نقصان قابل قبول ہے۔

جواب:......دونوں جگہ کی تمامی حالتوں کا خود مشاہدہ کر چکے ہو اب جیسا مناسب سمجھو کرو، مشورہ کے لئے علم حالات ضروری ہے میرے علم کی بنا روایات ہیں، گو وہ معتبر ہیں۔

دوبارہ سہارن پور میں:

اس خط کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولاناؒ کی طرف سے صراحۃً بھی سہارن پور جانے کی اجازت ہوگئی چنانچہ جامیؔ صاحب قدرے تاخیر سے اپنے چھوٹے بھائی رومیؔ صاحب اور مولانا کے صاحبزادے لقمان صاحب کو لیکر سہارن پور چلے گئے، سہارن پور میں ان کے لئے یہ کتابیں تجویز ہوئیں مختصر المعانی، شرح وقایہ بعدہٗ تعلیم المتعلم، سلم العلوم بعدہٗ ہدیہ سعیدیہ، مقامات حریری بعدہ سبعہ معلقہ، نور الانوار۔

مولانا اسعد اللہ صاحب سے ملاقات:

سہارن پور پہونچے اور اساتذہ سے ملاقاتیں شروع ہوئیں تو حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب خلیفہ حضرت تھانویؒ سے ملاقات ہوئی، مولانا زبردست ادیب اور برجستہ گو شاعر تھے، جامیؔ صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ میرا چھوٹا بھائی عبد القدوس رومیؔ ہے تو مولانا نے برجستہ یہ شعر کہا ؎

ایک رومؔی ہیں ایک جامؔی ہیں
اپنے مذہب کے دونوں حامی ہیں

اب سہارن پور میں اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ تعلیم شروع ہوگئی لیکن حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحبؒ کو اندیشہ تھا کہ نہ جانے وہاں کے حالات کیسے ہوں؟ اس کی اطلاع دیتے ہوئے جامی صاحب لکھتے ہیں:

> ’’اس سال یہاں بفضلہٖ اب تک نہایت امن وسکون ہے پڑھائی بہت اطمینان سے ہورہی ہے کچھ دیر ہوجانے کے سبب کچھ اسباق رہ گئے تھے لیکن الحمدللہ اس کی تلافی ہوگئی۔
>
> جواب:...... ذرا تفصیل سے لکھتے تو مزید تسلی ہوتی کہ گذشتہ باتیں طلباء اور مدرسین میں ہیں یا نہیں؟ مادے تو موجود ہی ہوں گے، قانونی دباؤ سے دبے ہوں گے۔

اس کے جواب میں جامی صاحب نے جو تفصیل لکھی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت کی فضا میں ان تحریکات کا کتنا نفوذ تھا لکھتے ہیں:

> گذشتہ سال جتنے لڑکے فتین تھے ان کو نیز جن سے آئندہ کو شر کا خطرہ تھا کل پچاس ساٹھ لڑکوں کو مدرسہ سے نکال دیا گیا، قوانین میں اضافہ ہوا، چنانچہ کسی تقریر میں شرکت کرنے کی اجازت نہیں ہے لیکن خود یہاں شہر میں ....کا زور ہے.................کی تقریریں اکثر ہوتی رہتی ہیں جس سے طلبہ عموماً......سب نہیں......راغب اسی جانب کو معلوم ہوتے ہیں اور معلوم ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہ محض مدرسہ کے قوانین سے مجبور ہیں ورنہ علانیہ شرکت کرتے، مدرسین کی کوئی شرکت بظاہر نہیں معلوم ہوتی در پردہ واللہ اعلم بالصواب، تعلیم بفضلہٖ تعالیٰ پرامن طریقہ سے ہورہی ہے۔‘‘

◆ ◆ ◆ ◆ ◆

باب ۵

بارگاہِ تھانویؒ میں

سہارن پور کی زمانۂ قیام میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں حاضری کا شرف بھی حاصل ہوتا رہا، جامؔی صاحب جس ماحول سے آئے تھے وہ پورا حضرت تھانویؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل تھا، حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب حضرت کے مخصوص خلفاء میں سے تھے، والد صاحب بھی حضرت سے بیعت تھے، تھانہ بھون سہارن پور سے قریب ہے، سہارن پور سے شاہدرہ چھوٹی لائن کی ٹرین جو چلتی تھی اسی لائن پر تھانہ بھون کا اسٹیشن تھا، اس وقت علم وفضل، شریعت وطریقت کا یہ آفتاب غروب ہونے کے قریب تھا، چراغ جھلملا رہا تھا لیکن اس کی روشنی سے غیر منقسم ہندوستان کا گوشہ گوشہ منور تھا، جامی صاحب نے کسی خط میں سہارن پور کی وجہ ترجیح میں حاضری تھانہ بھون کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ پہلی مرتبہ تھانہ بھون کب حاضر ہوئے؟ اس کی تاریخ نہیں ملی، اغلب یہ ہے کہ جس سال پہلی مرتبہ سہارن پور تعلیم کیلئے حاضر ہوئے تھے اسی سال تھانہ بھون بھی حاضری دی ہوگی۔

حضرتؒ کے یہاں دستور تھا کہ تحریری یا زبانی طور پر آنے والا اپنی حاضری کو، کہاں سے آیا ہے؟ کیوں آیا ہے؟ صاف صاف بتادے تاکہ اسی لحاظ سے اس کے ساتھ معاملہ کیا جاسکے جامی صاحب نے حاضری کے بعد ایک تحریر پیش کی وہ درج ذیل ہے:

''احقر ایک طالب علم ہے، مظاہر علوم سے حاضر ہوا ہے، فقط آنحضرت کی زیارت وملاقات مقصود ہے، قواعد خانقاہ معلوم ہیں بصورت عدم نفع نہ تو کسی قسم کا کوئی افسوس ہوگا اور نہ اس کے ذمہ دار آنجناب ہیں، بلکہ خود اپنا ہی کھوٹ ہوگا۔ قیام تین روز رہے گا۔ فقط۔ خادم عبدالرحمٰن

حاضری بار بار ہوتی رہی اور حضرت تھانویؒ کے التفات اور دعاؤں سے سرفراز ہوتے رہے، سہارن پور سے متعدد خطوط جامی صاحب نے حضرت تھانویؒ کی خدمت میں بھیجے اور جواب سے سرفراز ہوئے، جامی صاحب نے ان خطوط کی جان کی طرح حفاظت کی اور اپنے پاس انھیں محفوظ رکھا، اب جب کہ جامیؔ صاحب کے حالات لکھے جارہے ہیں تو خیال ہوا کہ ان خطوط کو من وعن شائع کر دیا جائے گو ان میں سے بیشتر میں کوئی سلوک کا مسئلہ نہیں، کوئی خاص علمی چیز نہیں محض طلب دعاء ہے اور اس کے جواب میں دعاء ہے، مگر یہ خطوط یادگار اور تبرک ہیں اور خاموش زبان سے اس بات کی ترغیب وتحریص ہیں کہ دور طالب علمی ہی سے بزرگوں سے تعلق رکھنا چاہئے، آدمی اس طرح کتنے ظاہری شرور وفتن سے حفاظت میں رہتا ہے۔ طلبۂ علوم دینیہ اگر اس کو اپنا دستور العمل بنالیں تو یہ نت نئے نئے فتنے جو فضا میں برس رہے ہیں ان سے بڑی حد تک حفاظت رہے گی۔

حضرت تھانویؒ کے نام جامی صاحب کا پہلا خط جو مدرسہ اشرفیہ چک الہ آباد سے لکھا گیا تھا وہ نقل ہو چکا ہے، باقی یہاں ملاحظہ فرمائیں:

(۱)

''سیدی وسندی وسیلۃ یومی وغدی حضرت مولانا دامت برکاتہم وفیوضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

''گذارش خدمت اقدس میں یہ ہے کہ احقر خدا کے فضل وکرم اور جناب

کی دعاء سے خیریت سے ہے اور آنجناب کی خیر وعافیت کا طالب۔

امسال احقر مدرسہ اشرفیہ سے یہاں مدرسہ عربیہ مظاہر علوم میں آ گیا ہے اور اب شرح جامی اور کنز الدقائق وغیرہ درس میں ہے، جناب کی خدمت میں نہایت مؤدبانہ گذارش ہے کہ احقر کے لئے دعائے خیر فرمائیں، اللہ تعالیٰ علم نافع وعمل صالح کی توفیق عطا فرمائیں اور آفات ارضی وسماوی سے محفوظ رکھیں۔

فقط والسلام علیکم

خادم محمد عبدالرحمٰن بن سراج الحق صاحب الہ آبادی
متعلم مدرسہ عربیہ مظاہر علوم سہارن پور
۷؍ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۷ھ

جواب:......السلام علیکم۔ دل سے دعا کرتا ہوں۔

(۲)

سیدی وسندی وسیلۃ یومی وغدی حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا دامت برکاتہم وفیوضہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

بعد سلام مسنون بصد تعظیم کے گذارش خدمت اقدس میں یہ ہے کہ احقر مدرسہ عربیہ اسلامیہ مظاہر علوم میں تعلیم حاصل کر رہا ہے، تعطیل عیدالاضحیٰ میں حضرت والا کے یہاں بقصد زیارت وملاقات حاضر بھی ہوا تھا، حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کا دستی خط جس میں مولانا نے آنکھ میں تکلیف ہوجانے کی اطلاع دی تھی احقر ہی لے گیا تھا، اس وقت محض اپنی لاپروائی کی بناء پر چشمہ لگائے ہوئے تھا جس پر حضرت والا نے تنبیہ فرمائی تھی، یوں تو حضرت والا سے عقیدت بحمد اللہ بہت دنوں سے ہے بواسطہ جناب والد مولوی محمد سراج الحق صاحب، لیکن حضرت کی اس تنبیہ کے بعد سے حضرت والا سے محبت اور زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

جواب:...... ماشاءاللہ آپ کی سلامت فطرت ہے۔ بارک اللہ فیکم۔

خط:...... جناب کی خدمت میں نہایت ادب سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے لئے دعا فرمادیں اللہ تعالیٰ علم نافع عمل صالح کی توفیق عطا فرماوے۔ فقط والسلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہٗ

خادم بندہ محمد عبدالرحمٰن غفرلہٗ ابن مولوی سراج الحق صاحب مچھلی شہری۔
متعلم مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور ۲۶؍ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ

جواب:...... دل سے دعاء ہے۔

اس مکتوب میں جس تنبیہ کا ذکر ہے اس کے متعلق میں نے جامی صاحب سے براہ راست سنا ہے کہ بقرعید کی تعطیل میں وہ حضرت کی خدمت میں تھانہ بھون حاضر ہوئے اس وقت آنکھوں پر عینک لگی ہوئی تھی، اس پر حضرت نے سوال کیا کہ یہ عینک کیوں لگی ہوئی ہے؟ عرض کیا بینائی کمزور ہے، حضرت نے فرمایا کہ راستہ بھی نظر نہیں آتا؟ عرض کیا وہ تو آتا ہے۔ حضرت نے قدرے تیز لہجہ میں فرمایا یہ سب نہیں، تکلف ہے، زیب وزینت کا شوق ہے، طلبہ کو سادگی سے رہنا چاہئے بس کچھ نہیں صرف لاپروائی ہے۔ جامی صاحب نے فوراً عینک اتار لی اور معافی مانگ لی، حضرت نے معاف کردیا۔ اس وقت عینک کا رواج کم تھا ابھی دل کے نور کی طرح آنکھوں کا نور ختم نہیں ہوا تھا۔ اس وقت عینک لگانا فیشن میں داخل تھا بالخصوص نوجوانوں کے لئے، اور سچ پوچھئے تو اس دور میں بھی جب کہ نگاہ کی کمزوری بالکل عام ے اب بھی کتنے فیشن ہی کے طور پر عینک لگاتے ہیں، یہ خوبصورت رنگ برنگ کے ڈیزائن، عمدہ سے عمدہ فریم ان کی مزین سنہری کمانیاں اور ان میں خوبصورت سے خوبصورت تر کا انتخاب، آخر فیشن نہیں تو اور کیا ہے؟

حضرت نے اسی پر تنبیہ فرمائی تھی کہ طالب علم کو ان خرافات ولغویات میں نہیں

پڑنا چاہئے، فرماتے تھے کہ جب کسی طالب علم کو دیکھتا ہوں کہ وہ بنتا اور سنورتا ہے تو سمجھ جاتا ہوں کہ اندر سے خالی ہے اسی لئے خارجی زیب وزینت کی اسے ضرورت ہوئی ہے۔

(۳)

''سیدی وسندی وسیلۃ یومی وغدی حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا دامت برکاتہم وفیوضہم۔ **السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ**

احقر مدرسہ مظاہر علوم میں تعلیم دین حاصل کر رہا ہے۔ بفضلہٖ تعالیٰ خیریت سے رہ کر آنحضرت کی عافیت مزاج گرامی کا خواہاں! بعدہ بصد ادب درخواست ہے کہ حضرت والا اس ناکارہ کے حق میں دعا خیر فرمائیں، حق تعالیٰ علم نافع اور عمل صالح عطا فرمائیں نیز اس دور میں ہر چہار طرف فتنہ وفساد برپا ہے، حق تعالیٰ صراط مستقیم پر چلادے اور اپنے اکابرین اہل حق کے دامن سے وابسطہ (**حاشیہ**: اس خط میں جامی صاحب سے ''وابستہ'' کے املا میں غلطی ہوئی انھوں نے بجائے ''تا'' سے لکھنے کے ''ط'' سے لکھ دیا ''بسط'' کے مقابل میں ''قبض'' آتا ہے، اسی مناسبت سے حضرت بطور ظرافت کے لکھا ''یعنی واقبضہ نہ رکھیں'' اس میں لطیف انداز سے اصلاح بھی ہوگئی اور اس بات کی جانب اشارہ بھی ہوگیا کہ یہ جملہ بے معنی ہوگیا جیسا کہ واقبضہ بے معنی ہے۔) رکھے۔

فقط والسلام مع الاحترام

بندہ عبدالرحمٰن غفرلہٗ ابن مولوی سراج الحق الہ آبادی
حال مقیم شہر فتحپور رہسوہ، متعلم مدرسہ عربیہ اسلامیہ مظاہر علوم سہارنپور
۲۵/ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۸ھ

جواب:......السلام علیکم ''یعنی واقبضہ نہ رکھیں'' سب مقاصد کے لئے دعا کرتا ہوں۔

(۴)

سیدی وسندی وسیلۃ یومی وغدی حکیم الامت مجدد الملت
سراپا خیر وبرکت حضرت مولانا دامت برکاتہم، وفیوضہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

بعد سلام مسنون بصد تعظیم کے گزارش خدمت اقدس میں یہ ہے کہ احقر بفضلہٖ تعالیٰ خیریت سے رہ کر آنحضرت کی خیر وعافیت مزاج گرامی کا خواہاں!

بندہ مدرسہ مظاہر علوم میں تعلیم دین حاصل کر رہا ہے۔ حضرت کی خدمت میں گزارش ہے کہ ترقی علم وعمل، فلاح دارین، کامیابی امتحان، صحت وعافیت کے لئے دعاء فرمادیں۔ فقط والسلام مع الاحترام

بندہ عبدالرحمٰن غفرلہٗ ابن مولوی سراج الحق مچھلی شہری ثم فتحپوری
متعلم مدرسہ مظاہر علوم، سہارن پور ۲۸ رجب ۱۳۵۸ھ پنجشنبہ

جواب:......السلام علیکم، خیریت سے ہوں، دعا کرتا ہوں

(۵)

سیدی وسندی وسیلۃ یومی وغدی حضرت مولانا دامت برکاتہم وفیوضہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

بفضلہٖ تعالیٰ خیریت سے رہ کر آنجناب کی عافیت مزاج گرامی کا خواہاں!

مرے گذشتہ خط کے ساتھ آنجناب نے ایک شجرۂ عربیہ منظوم عطا فرمادیا تھا جس کو میں تلاوت قرآن مجید کے بعد پڑھ لیا کرتا تھا، لیکن بسبب سستی کے کبھی کبھی ناغہ بھی ہوتا رہا اور ادھر مکان گیا تھا غلطی سے وہیں رہ گیا، مگر اب میں نے معظمی جناب والد محمد سراج الحق صاحب کے کہنے سے مناجات مقبول خرید لی ہے، چنانچہ اس میں سے پڑھ لیا کرتا ہوں۔

جناب سے عرض ہے کہ اس کی منزلیں بھی پڑھنی بھی مناسب ہیں یا نہیں یا فقط شجرہ پر فی الحال اکتفا کروں، جناب والد صاحب نے فرمایا تھا کہ روزانہ ایک منزل پڑھ لیا کرو لیکن چونکہ آنجناب اس طریق کے طبیب حاذق ہیں اس لئے اجازت چاہتا ہوں، نیز یہ کہ حضرت کی اجازت ان شاء اللہ اس کے دوام اور استلزام میں معین ہوگی۔

ترقی علم وعمل، صحت وعافیت، اپنے اکابرین اہل حق کے طریق پر استقامت کے لئے دعاء کی باادب درخواست کرتا ہوں۔

فقط والسلام مع الاحترام
خادم عبدالرحمٰن غفرلہٗ متعلم مدرسہ عربیہ مظاہر علوم سہارنپور
۱۳؍ربیع الاول ۱۳۵۹ھ

جواب :......السلام علیکم۔ تمھاری اصلاح جس سے متعلق ہے اس سے کیوں نہیں کہتے۔

آخر عمر میں حضرت تھانویؒ نے ارادت مندوں کے اصلاحی امور سے خود کو فارغ کر لیا تھا جو بیعت ہونا چاہتے تھے انھیں بیعت تو کر لیتے مگر اصلاح کے لئے اپنے کسی مجاز کے حوالے کر دیتے جس سے طالب کو مناسبت ہوتی، اور اگر کوئی اپنی اصلاح وتربیت حضرت ہی سے چاہتا تو اسے بیعت نہیں کرتے تھے اس کے لئے ایک اعلان چھپوا رکھا تھا، مولانا جامی صاحب حضرت تھانویؒ سے بیعت ہونا چاہتے تھے لیکن چونکہ حضرت عموماً طالب علموں کو بیعت کرنا پسند نہیں کرتے تھے اس لئے اس کی سعادت نہ حاصل ہوسکی، تاہم اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنا اصلاحی ربط حضرت سے قائم کرنا چاہتے ہیں حضرت تھانویؒ کو معلوم تھا کہ ان کا خاص تعلق حضرت کے معتمد خاص حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحبؒ سے ہے غالباً حضرتؒ کے ذہن میں یہ آیا کہ انھیں سے اصلاحی

تعلق ہے اس لئے ادھر متوجہ فرمادیا، چنانچہ مولانا جامی صاحب کی سعادت مندی تھی کہ انھوں نے پھر کوئی اصرار نہیں کیا، البتہ اپنا عندیہ لکھ بھیجا تاکہ کوئی ابہام نہ رہے۔

(۶)

سیدی وسندی وسیلۃ یومی وغدی حضرت مولانا دامت برکاتہم وفیوضہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہم

احقر مدرسہ مظاہر علوم میں تعلیم دین حاصل کر رہا ہے سوا حضرت والا کے اور کسی سے (اصلاحی) خط وکتابت نہیں ہے۔ حضرت کے پاس دعاء وغیرہ کے لئے خط لکھتا رہتا ہوں اسی بناء پر حضرت ہی کو پچھلے خط میں تکلیف دی تھی، پچھلا خط ارسال خدمت ہے۔

جواب:......السلام علیکم۔ اب مجھ میں قوت نہیں، اعلان دیکھو۔

خط:......آخر میں حضرت سے بصد ادب گزارش ہے کہ اس احقر کیلئے بھی فلاح دارین، ترقی علم وعمل، صحت وعافیت کے لئے دعا فرمادیں۔

فقط والسلام مع الاحترام
خادم عبدالرحمٰن ابن محمد سراج الحق صاحب مچھلی شہری
متعلم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور ۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۹ھ

اس خط کے بعد پھر اصلاح کے سلسلے میں مولانا جامی صاحب نے حضرت تھانویؒ کو تکلیف نہیں دی بلکہ اب باضابطہ اصلاح کے لئے حضرت مولانا شاہ محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادی کی جانب رجوع کیا، اب گویا جامی صاحب سلوک وتصوف کی راہ میں قدم رکھ رہے ہیں اس سے پہلے بھی ان کی تربیت اسی انداز پر ہو رہی تھی مگر ان میں ان کے ارادہ کو دخل نہ تھا، اب ان کی سلامت فطرت نے رہنمائی کی کہ کسی نہ کسی استاد ورہبر کی ضرورت ہے، چنانچہ انھوں نے اسی کیلئے حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب کو لکھا

اس کا تذکرہ ان شاء اللہ آئندہ آرہا ہے، قدرے انتظار کرنا ہوگا، آگے حضرت تھانویؒ کے نام خط ملاحظہ فرمائیں۔

(۷)

سیدی وسندی وسیلۃ یومی وغدی حضرت مولانا دامت برکاتہم وفیوضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

بفضلہٖ تعالیٰ خیریت سے رہ کر آنجناب کی خیریت مزاج گرامی کا خواہاں!

جواب:......السلام علیکم، خیریت سے ہوں۔

خط:......حضرت والا سے دعاء کی خط وکتابت تقریباً ایک سال سے جاری ہے لیکن پچھلے دنوں دو ایک بات علاوہ اس کے پوچھنے کی نوبت آگئی تھی، اس پر حضرت والا نے جواب کے ساتھ ساتھ ایک اعلان کا پرچہ ارسال فرمایا چنانچہ حسب موجب احقر نے مراسلت حضرت مولانا محمد عیسیٰ الہ آبادی مدظلہم سے شروع کر دیا ہے، دعاء فرمائیے حق تعالیٰ شانہٗ برکت عطا فرماوے اور اپنے ان اکابرین کے واسطے سے اتباع سنت کی توفیق بخشے، نیز یہ کہ احقر مدرسہ مظاہر علوم میں تعلیم دین حاصل کر رہا ہے ترقی علم وعمل، صحت وعافیت کیلئے دست بستہ دعاء کی درخواست ہے۔ فقط والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

خادم بندہ عبدالرحمٰن غفرلہٗ بن محمد سراج الحق صاحب مچھلی شہری
متعلم مدرسہ عربیہ مظاہر علوم سہارن پور ۱۱؍رجب جمعہ

جواب:......دعا کرتا ہوں۔

(۸)

حکیم الامت مجدد الملت، سراپا خیر وبرکت حضرت مولانا

دامت برکاتہم وفیوضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

احقر بفضلہٖ تعالیٰ خیریت سے رہ کر آنجناب کی عافیت مزاج گرامی کا خواہاں!

جواب:......السلام علیکم۔ خیریت سے ہوں۔

خط:......آنجناب سے درخواست ہے کہ احقر کیلئے دعاء فرمائیں حق تعالیٰ اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں اور اپنے اکابرین اہل حق کے دامن کے ساتھ وابستہ رکھیں نیز کامیابی امتحان اور صحت وعافیت کے لئے بھی دعاء فرماویں۔

فقط والسلام مع الاحترام
بندہ عبدالرحمٰن غفرلہٗ بن محمد سراج الحق صاحب
مقیم چمن گنج (شفیع آباد) کانپور ١٢/ر رمضان المبارک

جواب:......دعاء کرتا ہوں۔

(٩)

سیدی وسندی وسیلۃ یومی وغدی حکیم الامت مجدد الملت سراپا خیر وبرکت حضرت مولانا مد فیوضہم العالیہ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

بحمد اللہ مع الخیر ہوں۔ آنجناب کی عافیت مزاج گرامی کا خواہاں!

جواب:......السلام علیکم، خیریت سے ہوں۔

خط :......اس سال احقر کی درجۂ اعلیٰ سال اول کی کتابیں ہو رہی ہیں، آنحضرت سے درخواست ہے کہ دعا فرماویں حق تعالیٰ علم نافع اور عمل صالح کی توفیق عطا فرماویں نیز اپنے اکابرین اہل حق کے دامن کے ساتھ وابستہ رکھیں۔

فقط والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

خادم عبدالرحمٰن بن محمد سراج الحق صاحب مچھلی شہری

متعلم مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور۔ ۲۰/ربیع الاول ۱۳٦۰ھ (یوم الجمعہ)

جواب:...... دعا کرتا ہوں۔

(۱۰)

سیدی وسندی وسیلۃ یومی وغدی حضرت مولانا دامت برکاتہم وفیوضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

احقر اسی ہفتہ حضرت کی زیارت کے لئے حاضر ہوا تھا تین دن قیام رہا، واپسی کے وقت اجازت کے کلمات کہتے ہوئے کچھ جھک گیا تھا، اس پر حضرت والا نے فہمائش فرمائی تھی کہ یہ صحابۂ کرام کے بالکل خلاف امر ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگ زمانہ کے تکلفات سے متاثر ہوئے اور حدود شرعیہ کا کچھ پاس ولحاظ نہ رہا، یہ یقیناً انتہائی بدقسمتی ہے، میں اس وقت تو حضرت سے کچھ کہہ نہ سکا لیکن بعد میں خیال آیا کہ مبادا حضرت کو میرے اس فعل سے تکلیف ہوئی ہو جس کے سبب سے حضرت کی طبیعت کچھ منقبض ہوگئی ہو، چنانچہ میں نہایت ادب سے آنحضرت کی خدمت میں معافی کا خواستگار ہوں، اور ان شاء اللہ ایسی غلطی تو اب صادر ہوگی ہی نہیں۔

جواب:...... السلام علیکم، سب معاف ہے۔

خط:...... آخر میں حضرت کی خدمت میں گزارش ہے کہ احقر کیلئے دعاء فرمائیں، حق تعالیٰ عالم باعمل بنائیں اور اپنے اکابرین اہل حق کے دامن کے ساتھ وابستہ رکھیں۔ **فقط والسلام علیکم ورحمۃ اللہ**

خادم عبدالرحمٰن بن محمد سراج الحق مچھلی شہری

متعلم مدرسہ عربیہ مظاہر علوم سہارن پور ١٩/ جمادی الاولیٰ ١٣٦٠ھ

جواب:......دعا کرتا ہوں۔

ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ جامی صاحب ایک صاحب استعداد اور نیک وصالح طالب علم تھے، ان کا دور طالب علمی غیر سنجیدہ حرکات، لہو ولعب اور خرافات ولغویات سے پاک تھا، اسی لئے ایک طرف جہاں انھیں اپنی تعلیم کی پختگی اور عمدگی کی فکر تھی وہیں علم کی نافعیت اور عمل کی صالحیت کی بھی دھن تھی اور اس کا خیال برابر دامنگیر رہا کہ زمانے کے شرور وفتن میں مبتلا ہو کر کہیں اکابر اہل حق کے صراط مستقیم سے ہٹ نہ جائیں، چنانچہ بار بار حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے اس کے لئے دعاؤں کے ملتجی ہوتے ہیں۔

◆ ◆ ◆ ◆ ◆

باب ۶

فراغت اور تدریس

اسی طرح جامی صاحب اپنی تعلیم اور ذوق ومزاج کی تربیت وتزکیہ میں منہمک رہے، یہاں تک کہ شعبان ۱۳۶۲ھ میں رسمی طالب علمی سے فارغ ہوگئے، ابھی مدرسہ مظاہر علوم میں ہی تھے کہ انھیں معلوم ہوا کہ مدرسہ اسلامیہ فتحپور ہسوہ میں ایک مدرس کی ضرورت ہے، انھوں نے وہیں سے درخواست بھیج دی اور اپنے بعض خاص اساتذہ سے تائید وتوثیق کی درخواست کی، چنانچہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کامل پوری صدر المدرسین جامعہ مظاہر علوم اور حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب نے اپنی اپنی تائیدات لکھ کر حوالے کیں، یہ دونوں بزرگ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے جلیل القدر خلفاء میں سے تھے، حضرت اسعد اللہ صاحب بعد میں مدرسہ کے ناظم بھی بنائے گئے۔

حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ کامل پوری نے تحریر فرمایا:

> ”میں اس امر کی تصدیق کرتا ہوں کہ مولوی عبدالرحمٰن صاحب الہ آبادی چند سال سے مدرسہ مظاہر علوم میں باقاعدہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں، ان کے شریفانہ طرز عمل اور صلاح کا معترف ہوں اور بصمیم قلب مداح ہوں، میں ان کو ایک ذی استعداد عالم باعمل سمجھتا ہوں مجھے قوی امید ہے کہ مولوی صاحب تعلیم کے کام کو باحسن وجوہ انجام دے سکیں گے۔ ناکارہ عبدالرحمٰن
>
> (صدر مدرس مظاہر علوم)

حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب کی تحریر عربی میں ہے انھوں نے لکھا ہے:

حامداو مصلیاً اما بعد! فیقول العبد الاواہ اسعد، اسعدہ اللہ انی فرح بتصدیق ان اخی فی الدین المولوی عبدالرحمٰن اقام بالمدرسۃ مظاھر العلوم مدۃ طویلہ بالتی ھی احسن وعاشر الاساتیذ والتلامیذ بالمعروف وھوفیما اری واظن شاب صالح اھل للتعلیم والافادۃ فانہ کسب العلوم النقلیۃ والفنون العقیلۃ بالتدبر والاتقان ولہ ید صالحۃ فیھا ارجومن اللہ تعالیٰ ان المدرسۃ التی یدرس فیھا المولوی عبدالرحمٰن تفتخر بہ وتجتنی ثمار الاشتھار بالفضل والاعتبار فانہ یرضی الخواص والعوام بجودۃ استعدادہ وحسن تربیتہ ان شاء اللہ تعالیٰ.

استکتبہ اسعد اللہ لغرۃ شعبان ۱۳۶۳ھ

ترجمہ: حمد وصلوٰۃ کے بعد بندۂ عاجز اسعد، اسعدہ اللہ عرض گزار ہے کہ مجھے یہ شہادت دیتے ہوئے مسرت ہورہی ہے کہ میرے برادر دینی مولوی عبدالرحمٰن سلّمہٗ ایک طویل مدت تک مدرسہ مظاہر العلوم میں اچھے طریقے پر رہے، ان کا معاملہ اساتذہ اور طلبہ کے ساتھ قابل تعریف تھا اور جہاں تک میرا حسن ظن ہے وہ ایک جوان صالح ہیں، تعلیم وافادہ کے اہل ہیں، انھوں نے علوم نقلیہ اور فنون عقلیہ کو تدبر اور پختگی کے ساتھ حاصل کیا ہے انھیں اس میں اچھی مہارت حاصل ہے، مجھے اللہ کی ذات سے توقع ہے کہ جس مدرسہ میں یہ تدریس کی خدمت انجام دیں گے وہ ان پر فخر کرے گا۔ اور لوگوں کے درمیان فضل واعتبار کی شہرت حاصل کرے گا۔ یقین ہے کہ مولوی صاحب موصوف اپنی خوبی استعداد اور حسن تربیت سے عوام وخواص دونوں کو خوش اور مطمئن رکھیں گے۔ انشاءاللہ

بڑے اساتذہ جو کھرے کھوٹے کی شناخت رکھتے ہیں اور کسی کی تعریف وتوصیف میں محتاط بھی ہیں، ان کی یہ شہادت بڑا وزن رکھتی ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں بزرگوں کے حسن ظن کی لاج رکھی اور جیسی توقعات ان اکابر نے ظاہر کیں تھیں دم آخر تک ان کا ظہور ہوتا رہا۔

مدرسہ اسلامیہ فتح پور:

مدرسہ اسلامیہ فتح پور ایک قدیم ادارہ ہے، اس کے بانی حضرت مولانا ظہور الاسلام صاحبؒ کا نام ندوہ کے ابتدائی بانیوں میں آتا ہے، یہ حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے اجل خلفاء میں تھے۔ صاحب دل اور صاحب درد بزرگ تھے، ندوے نے قدیم وجدید کا مرکب تیار کیا تھا یہ مدرسہ اس کا ایک نمونہ تھا، ایک طرف عربی درس گاہ بھی ہے دوسری طرف انگریزی درسگاہ بھی ہے، اس مدرسہ کو اچھے اچھے اساتذہ حاصل ہوئے لیکن شاید جدید وقدیم کی کشمکش ان سے مدرسہ کو محروم کرتی رہی۔

حضرت مولانا ابرار الحق صاحب ہردوئی اس مدرسہ میں مدرس رہے، غالباً وہ ایک سال کے بعد چلے گئے وہی جگہ خالی ہوئی تھی جہاں مولانا عبدالرحمٰن جامی کا تقرر ہوا، ان کے ایک دو سال کے بعد مشہور بزرگ عالم حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی مدظلہ تشریف لائے، حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب مدظلہ کو حضرت مولانا جامی صاحب سے بہت گہرا لگاؤ تھا، حضرت مولانا کے سامنے جب بھی میں نے جامی صاحب کا تذکرہ چھیڑا تو وہ آبدیدہ ہوگئے، فرماتے مولانا جامی صاحب جیسا مخلص، بے غرض محبت کرنے والا انسان نہیں ملے گا، ہم دونوں فتحپور میں تین سال تک ساتھ رہے اور ہمہ وقت ساتھ رہے ہم لوگ صرف رات کو بارہ بجے جب اپنے اپنے گھر سونے کیلئے جاتے جبھی جدا ہوتے تھے، اس کے علاوہ تمام اوقات میں ایک ہی جگہ رہتے ایک ہی تخت پر بیٹھے، لیکن مولانا فرماتے ہیں کہ دو باتیں عجیب

رہیں، ایک تو یہ کہ ہم دونوں میں اتنی مدت میں اتنی ہمہ وقتی ملاقات میں کبھی رنج وملال کی بات نہیں ہوئی، کبھی ایک دوسرے سے کوئی تکلیف نہیں پہونچی، اور یہی حال دونوں کے گھروں میں بھی تھا۔ ایک دوسرے سے غایت درجہ محبت تھی، بلکہ مولانا جامی صاحب کی پہلی صاحبزادی جو ابھی بچی تھیں، زیادہ تر حضرت مولانا صدیق احمد صاحب کے گھر پر ہی رہتی تھیں، رات کو وہیں سو جاتی تھیں، کبھی جامی صاحب انھیں بعد میں اٹھا کر گھر لے آتے اور کبھی وہیں چھوڑ دیتے، غرض دونوں گھروں میں بے حد اتحاد تھا۔

یہ دونوں بزرگ بالکل **المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده.** کے نمونے تھے، جامی صاحبؒ تو خدا کے حضور پہونچ گئے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات کو بلند فرمائے، اور حضرت مولانا کا سایہ باقی ہے، حق تعالیٰ ان کی عمر، ان کے کام ان کے فیضان میں برکت دے اور انھیں صحت وعافیت کے ساتھ رکھے۔ (افسوس کہ اس کتاب کی اشاعت سے پہلے ہی حضرت وصال فرما گئے)

دوسری عجیب بات جو حضرت مولانا مدظلہ نے بتائی وہ یہ کہ ہمہ وقت ساتھ رہنے کے باوجود دن بھر میں شاید دو ایک بات کرنے کی نوبت آتی ہو، دونوں ہر وقت کتابوں کے مطالعہ میں، سبق کی تیاری میں مشغول رہتے، اتنی فرصت ہی نہ ہوتی کہ گفتگو کی نوبت آئے، یہ شوق علم اور حفاظت وقت کی خاص شان دونوں بزرگوں میں تھی اسی لئے اللہ تعالیٰ نے دونوں کے وقت میں برکت دی اور دونوں سے عظیم الشان کام ہوا۔

ایسے صالح اور ذی استعداد نوجوان علماء کی موجودگی میں مدرسہ کی ترقی کے امکانات تھے مگر ارباب انتظام تو ارباب انتظام ہیں، ان کے مصالح کے سامنے کتنی ہی علمی دینی مصلحتوں کا خون ہو جائے پرواہ نہیں، کتنے بڑے بڑے جید علماء ارباب انتظام وارباب حکومت کی مصلحتوں کے نشانہ پر چڑھ گئے، اس کی ایک لمبی داستان ہے۔ نہ معلوم کیا کشمکش تھی، مگر کچھ کشمکش تھی اب نہ اس کی تحقیقات کی جا سکتی اور نہ

اس کی ضرورت ہے، غرض اسی کشمکش سے متأثر ہوکر مولانا جامی صاحب نے پانچ سال اس مدرسہ میں تعلیم دے کر اسے چھوڑ دیا۔

حضرت مولانا صدیق احمد صاحب ان سے پہلے وہاں سے تعلق ختم کر چکے تھے، وہاں پڑھانے کے دوران انھیں وحشت ناک خبر ملی کہ باندہ کے بعض علاقوں میں ارتداد کی وبا پھوٹ پڑی ہے، حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ جب یہ خبر میں نے سنی تو دل میں سخت اضطراب پیدا ہوا، اس کی خبر کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ بات صحیح ہے حالانکہ اس سے پہلے بلکہ طالب علمی کے زمانے ہی سے پڑھانے کا شوق بہت تھا، اسی لئے کتابوں کو نہایت محنت سے پڑھا تھا اور ہر فن کی کتابیں پڑھیں تھیں مگر جب یہ خبر سنی تو پڑھانے سے دل سرد ہو گیا اور اب اونچی کتابیں پڑھانے کا شوق دل سے نکل گیا، اور یہ ہول سما گیا کہ اگر حق تعالیٰ نے قیامت کے دن اس ارتداد کے متعلق سوال کر لیا تو کیا جواب ہوگا؟ یہ سوچ کر انھوں نے مدرسہ چھوڑ کر مرتدین کو اسلام کی طرف واپس لانے میں جی جان کی بازی لگا دی، اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی اور جو لوگ مرتد ہو گئے تھے ان میں سے اکثر حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔

حضرت مولانا نے اس کے اسباب پر غور کیا تو اس کا بڑا سبب مسلمانوں میں دینی علوم سے جہالت کو پایا، مولانا نے عزم کیا کہ اس کا مستقل علاج کرنا چاہئے چنانچہ وہ اپنے چھوٹے سے گاؤں میں بچوں کو لا لا کر ایک نئے مدرسہ کی آبادکاری میں لگ گئے، مولانا، باندہ جیسے کٹھور اور سخت ضلع کی ایک سنگلاخ زمین میں جھونپڑی ڈال کر بیٹھ گئے اور وہ جھونپڑی ہوا میں اڑتی رہی، پانی میں ٹپکتی رہی، سیلاب میں بہتی رہی، طلبہ واساتذہ دوڑ دوڑ کر اسے پکڑتے رہے، بہہ جاتی اڑ جاتی تو دوسری جھونپڑی بنا لیتے، پھر ایک سے دوسری، دوسری سے تیسری جھونپڑیوں کا مدرسہ بنتا چلا گیا، حضرت قاری صاحب کے خلوص، محنت، دل سوزی اور دلجمعی کا اب جا کر کوئی منظر دیکھے تو ایک

چھوٹا سا دیہات ایک عظیم الشان دینی ادارے، اس کی خدمات، اس کے علماء وفضلاء اس کے طالبین اور طلباء سے معمور اور مالا مال ہے۔

اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب وہاں سے الگ ہوئے تو تقدیر ان کے لئے اور بندوبست کررہی تھی، جس طالب علم نے بار بار حضرت تھانویؒ سے یہ دعا کرائی تھی کہ ”حق تعالیٰ عالم باعمل اور اپنے اکابرین اہل حق کے دامن کے ساتھ وابستہ رکھیں“ اور حضرت تھانویؒ نے بار بار اس کی دعائیں کی تھیں، حق تعالیٰ کے دربار میں یہ نیک آرزو، یہ بہترین دعاء، قبولیت سے سرفراز ہوئی۔ مدرسہ اسلامیہ فتحپور میں تھے تو پوری ایک کمیٹی کی تابعیت تھی نہ جانے اس میں کس کس خیال کے لوگ رہے ہوں اور بعد میں کس کس خیال کے لوگ آتے، حق تعالیٰ کا دست مخفی انتظام کرتا رہا کہ اصاغر اور وہ بھی متعدد مختلف الخیال اصاغر کے بجائے ایک بڑے کے دامن سے اس طرح وابستہ کردئے جائیں، کہ کسی اور کا ان پر کوئی تصرف ہی نہ رہے، لیکن اس انتظام کو جاننے کے لئے قدرے انتظار کرنا ہوگا اسے ایک باب کے بعد ملاحظہ فرمائیں۔

◆ ◆ ◆ ◆ ◆

باب ۷

بیعت واصلاح نفس

جس انداز سے اور جس ماحول میں مولانا جامی صاحب کی تربیت وتعلیم ہورہی تھی اس کا فطری تقاضا تھا کہ وہ کسی اللہ والے کے دامن فیض سے باقاعدہ وابستہ ہوکر اصلاح نفس کا فریضہ بجالائیں اور حق تعالیٰ کی محبت ومعرفت حاصل کریں، ایک تو خود والد محترم نہایت دیندار، نیک نفس، مخلص اور حضرت تھانویؒ سے نسبت رکھنے والے، دوسرے ایک مسیحا نفس بزرگ حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب علیہ الرحمہ کی خدمت میں بچپن سے حاضری، ان کے مشوروں کی تعمیل، ان کے احکام کی بجاآوری، ان کی دعاؤں کا سایہ، ان کے فیضان نظر کا اثر نیز سہارن پور میں حضرت تھانویؒ کے متعدد خلفاء کی شاگردی اور ان کی خدمت میں سعادتمندانہ حاضری اور پھر جامی صاحب کی ذاتی صلاحیت واستعداد، سلامت طبعی اور دینداری وسنجیدگی، ان سب چیزوں نے مل کر ان کے دل میں ایک لگن پیدا کردی تھی کہ طلب علم کے ساتھ راہ سلوک میں بھی گام فرسائی ہونی چاہئے۔

چنانچہ انھوں نے نہایت سادگی کے ساتھ اس کی ابتدا یوں کردی کہ حضرت تھانویؒ سے مناجات مقبول پڑھنے کی اجازت چاہی، اس وقت حکیم الامت گوکہ عمر کے آخری مرحلہ سے گزر رہے تھے مگر ان کے ارشاد وہدایت کا آفتاب ہر طرف نور بکھیر رہا تھا، ان کی عظیم وبابرکت شخصیت کے ہوتے ہوئے اس راہ کے سالک کو کسی اور

طرف توجہ ہوتی بھی تو کیسے؟ اور پھر ایک ایسا طالب علم جو اپنے گرد وپیش اور ماحول کو حضرت تھانویؒ ہی کی عقیدت کے چرچوں سے معمور پاتا ہو، باپ بھی انھیں کا عقیدت کیش، سرپرست بھی انھیں کی محبت سے سرشار، اساتذہ بھی انھیں کے دست گرفتہ اور نام لیوا، انھیں کی ہدایت پر انگریزی تعلیم سے نکال کر عربی تعلیم پر لگائے گئے، ان کی خدمت میں متعدد بار حاضری بھی ہو چکی، ان کی تنبیہ کی حلاوت بھی چکھ چکے، ان سے مراسلت بھی جاری ہے، ان کی دعاؤں سے سرفراز بھی ہو رہے ہیں پھر بھلا ان کے علاوہ کسی اور طرف ذہن جاتا تو کیونکر جاتا؟

گزشتہ مکاتیب میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ جب جامی صاحب نے حضرت مولانا تھانویؒ سے مناجات مقبول کی منزلیں پڑھنے کی اجازت چاہی تو حضرت نے انھیں لکھا کہ جن سے تمھاری اصلاح کا تعلق ہو ان سے کیوں نہیں کہتے؟ اس پر جامی صاحب نے پھر حضرت کو لکھا کہ میرا اصلاحی تعلق ابھی کسی سے نہیں ہے، مطلب یہ تھا کہ اس تعلق کو حضرت ہی منظور فرمالیں، حضرت نے قوت نہ ہونے کا عذر فرمایا، اب جامی صاحب کے نزدیک ایک شخصیت متعین تھی جس کے انفاس سے بچپن سے وہ اب تک مستفید ہوتے رہے تھے، وہ ان کے استاذ تھے، مربی تھے، سرپرست تھے، خاندانی بزرگ تھے ان کی شفقت وعنایت کے سائے میں اب تک عمر کی منزلیں طے کی تھیں، یعنی حضرت مولانا شاہ محمد عیسیٰ صاحب قدس سرہٗ۔ چنانچہ انھوں نے سہارن پور ہی سے مولانا کو خط لکھا:

سیدی وسندی وسیلۃ یومی وغدی حضرت مولانا دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

عرصہ سے قصد خط لکھنے کا کر رہا ہوں، لیکن زمانہ دراز سے نہ لکھنے کی شرم
دامن گیر ہو کر مانع بنتی رہی، حتیٰ کہ اس وقت منجانب اللہ ایسی صورت پیدا ہوگئی

جس نے آنجناب کے فیض سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کردیا۔

گزارش یہ ہے کہ احقر حضرت تھانوی سلمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت بابرکت میں وقتاً فوقتاً بغرض طلب عافیت ودعاء خط لکھتا رہتا تھا، سوایک بار حضرت نے ایک منظوم عربی شجرہ عنایت فرمایا اوراس پر تحریر فرمایا کہ اس کو خود پڑھ لیا کریں یا کسی پڑھنے والے کو دیدیں، میں نے جز اول کے بموجب خود بعد تلاوت کے پڑھنا شروع کیا، اس بار جو مکان گیا تو والد صاحب نے فرمایا کہ مناجاۃ مقبول بہت اچھی کتاب ہے اس کی ایک منزل تم بھی پڑھ لیا کرو، یہاں آکر میں نے حضرت کو لکھا اور اجازت طلب کی تاکہ وہ دوام کے لئے معین بن جائے، اس خط میں حضرت نے تحریر فرمایا کہ تمھاری اصلاح جس سے متعلق ہو اس سے کیوں نہیں کہتے پھر میں نے دوبارہ خط لکھا جو کہ آنجناب کے پاس بھی ارسال ہے اس کے ساتھ ساتھ ایک زرد پرچہ بھی آیا تھا جس میں حضرت نے اپنی معذوری اور مذکورین خلفاء کی طرف رجوع کرنے کو لکھا تھا، تو میں نے بعد غور وتامل کے آنجناب ہی کو اپنا شفیق ومحسن تجویز کیا، چنانچہ حسب ارشاد حضرت مدظلہ دعاء وغیرہ کے علاوہ اور جملہ خط وکتابت آنجناب سے کرنا چاہتا ہوں، امید کہ آنجناب اس کو منظور فرما کر شاکر وممنون فرمائیں گے۔

جواب:......السلام علیکم۔ توکلاً علی اللہ منظور کرتا ہوں۔

خط:......آخر میں جناب کی خدمت میں بصد ادب دعائے علم وعمل وصحت وعافیت کی درخواست ہے۔

جواب......دل وجان سے دعاء گو ہوں۔

خط:......نیز یہ کہ میرے پاس مناجاۃ مقبول موجود ہے، اگر حضرت مصلحت ومناسب سمجھیں تو اجازت فرمادیں۔

جــواب :......اجازت سے کیا مقصود ہے؟ ادعیۂ ماثورہ کی اجازت تو خود اللہ ورسول کی جانب سے ہے، پھر کسی کی اجازت کا کیا مطلب؟

حضرت مولانا نے اس بات پر تنبیہ فرمائی کہ جو دعائیں قرآن اور حدیث سے ثابت ہیں وہ ساری امت کے لئے عام ہیں، ان میں کسی شیخ اور بزرگ سے اجازت کی حاجت نہیں۔

جامی صاحب نے پھر مولانا کو لکھا:

> مناجات مقبول کی بابت جو اجازت چاہی تھی اس کا منشاء دراصل میری یہ غلطی ہوئی کہ میں نے اس کو دیگر اوراد وذکر ووظائف کے ساتھ خلط کر دیا تھا اور جیسا کہ مشہور ہے کوئی وظیفہ وغیرہ بغیر کسی فن داں کی اجازت کے نہیں شروع کرنا چاہئے، میں نے اس کو بھی ان پر قیاس کرلیا تھا۔
>
> میرے مناسب حال جو کتابیں ہوں حضرت والا ارشاد فرمائیں، خارج اوقات میں تھوڑا تھوڑا ان شاء اللہ مطالعہ میں رکھوں گا۔
>
> خادم بندہ عبدالرحمٰن ۲۶؍ جمادی الثانیہ

جــواب :......حضرت والا (تھانوی) کے مواعظ جس قدر بھی دستیاب ہوں مطالعہ میں رکھیں۔

جامی صاحب ابھی طالبعلم تھے، اس دور میں عموماً طبیعتوں میں آزادی پائی جاتی ہے لیکن ان کی سلامت طبع انھیں بہکنے نہیں دیتی، اس مکتوب کے بعد انھوں نے ارادہ کیا کہ حضرت تھانویؒ کے مواعظ کا خوب جی بھر کے مطالعہ کریں، مگر درسی کتابوں کی مشغولیت مانع بنتی رہی، گھر آتے تو فرصت میسر آتی اور ادھر انہماک بڑھ جاتا، ایک مکتوب میں حضرت الہ آبادی کو تحریر فرماتے ہیں:

> ’’جناب نے حضرت مولانا کے مواعظ کا مطالعہ تجویز فرمایا تھا سہارن پور

میں بوجہ قربِ امتحان چنداں موقع نہ مل سکا تھا، اب یہاں مکان پر کوئی خاص شغل نہیں ہے چنانچہ دیکھنے کا کافی موقع مل جاتا ہے، جناب سے عرض ہے کہ دعا فرمائیں حق تعالیٰ اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق بخشیں اور جسمانی وروحانی امراض سے محفوظ رکھیں نیز امتحان میں کامیاب فرماویں۔

اس کے جواب میں حضرت مولانا الہ آبادی نے تحریر فرمایا:......

''اس فرصت کو غنیمت جانئے **اغتنم خمساً قبل خمسٍ** میں **فراغک قبل شغلک** حدیث میں ہے۔

اللہ تعالیٰ سارے مقاصد میں کامیاب فرماویں اور اپنا محبّ ومحبوب بنالیں۔

قیامِ مظاہر علوم کے آخری سال میں جامی صاحب کی خواہش ہوئی کہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ سے اصلاح کا نہیں تو کم از کم بیعت کا تعلق قائم ہو جائے، لیکن چونکہ اصلاحی تعلق حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحبؒ سے استوار کر چکے تھے اس لئے ان کی اجازت اور مرضی کے بغیر کوئی نیا قدم نہیں اٹھا سکتے تھے، جامی صاحب نے ایک خط میں اپنی اس آرزو کا ذکر کیا لکھتے ہیں:

''اس ماہ میں دوبار تھانہ بھون حاضری کا شرف حاصل ہوا، اپنے بعض رفقاء کی سبقت نیز اپنے قیام سہارن پور کے آخری سال کا تصور اس امر کا محرک ہوا کہ حضرت تھانوی مدظلہٗ العالی سے اگر اصلاح نہیں تو بیعت ہی کا شرف حاصل کرلوں۔ حضرت والا مدظلہ نے اصلاحی تعلقات سے تو معذوری بیان فرمادی تھی جس کے بعد احقر نے آنجناب کو اپنا محسن ومصلح تجویز کیا اور اس کو جناب والا نے قبول بھی فرمالیا تھا۔

اب اس وقت دریافت طلب امر یہ ہے کہ حضرت والا کی اس میں کیا

رائے عالی ہے کہ میرا حضرت تھانوی مدظلہ العالی سے درخواست بیعت کرنا مناسب ہے یا نہیں، جیسا ارشاد ہوگا ان شاء اللہ اس پر عمل میرے لئے باعث فلاح و برکت ہوگا۔

حضرت مولانا نے جواب میں فرمایا:......

''طالب علمی کے زمانے میں حضرت مولانا پسند نہیں فرماتے''

اس خط کے بعد مولانا جامی صاحب نے پھر درخواست نہیں کی اور ابھی جامی صاحب سہارن پور ہی میں تھے کہ ۱۵؍رجب ۱۳۶۲ھ کی شب کو حضرت حکیم الامت کا وصال ہوگیا۔ انا للّٰہ وإنا الیہ راجعون۔

تعلیم سے فراغت کے بعد حضرت الہ آبادی سے باقاعدہ بیعت بھی ہوگئے تھے لیکن چند ماہ کے بعد ہی حضرت مولانا الہ آبادی کا بھی ۲۵؍ربیع الاول ۱۳۶۳ھ کو انتقال ہوگیا۔

* * * * *

باب ۸

بارگاہِ مصلح الامت میں (۱)

حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحبؒ کی وفات کے بعد پھر مرشد کی تلاش ہوئی، حق تعالیٰ نے رسائی اس وقت کے غیر معروف لیکن کامل تر شیخ و مرشد مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری نور اللہ مرقدہٗ کے آستانے تک کرادی۔

از برائے سجدہ کردن آستانے یافتم
سرزمینے بود منظور آسمانے یافتم

(سجدہ گزارنے کیلئے ایک چوکھٹ میں نے پالی مجھے تو زمین ہی قبول تھی مگر خدا کا کرنا کہ آسمان ہاتھ گیا)

حضرت مولانا کا یہ وہ دور تھا جب وہ تمام دنیا سے یکسو ہوکر اعظم گڈھ کے ایک ایسے دیہات میں گوشہ نشین تھے جہاں تک پہونچنا بلکہ اس کا جغرافیہ بھی معلوم کرنا دشوار تھا، لیکن ؎

ہر کجا بوئے خدا می آید خلق بیں بے سروپا می آید

(جس جگہ خداوند تعالیٰ کے معرفت و عبودیت کی خوشبو محسوس ہوتی ہے مخلوق کو دیکھو کہ ٹوٹی پڑتی ہے)

تاہم اس وقت یہ لعل شب چراغ ابھی ایک دیہات کی گدڑی میں لپٹا ہوا تھا جس سے اہل نظر بھی کم آشنا تھے، بہت خاص لوگ قدرے جانتے تھے، حضرت مولانا بھی مخلوق کے ہنگاموں سے بے نیاز اپنے مولیٰ کی یاد اور مناجات میں غرق تھے، مگر لعل اپنی تابانی کو گدڑی میں کب تک روپوش رکھ سکے گا، خوشبو کب تک غنچوں میں دبی پڑی

رہے گی آہستہ آہستہ اس کی تابانیاں اپنا دائرہ بڑھا رہی تھیں اور خوشبو اڑا اڑا کر خاص خاص طالبین کے مشام جاں کو معطر کر رہی تھیں۔

اسی دوران الہ آباد سے ابتداءً جامی صاحب کے چھوٹے بھائی مولانا عبدالقدوس صاحب رومی کی رسائی حضرت کی بارگاہ تک ہوئی، پھر ان کے بعد قافلے کا قافلہ الہ آباد سے فتحپور (تال نرجا) کی جانب رواں دواں ہوگیا، مولانا سراج الحق صاحب مچھلی شہری، مولانا قاری حبیب احمد صاحب الہ آبادی، حافظ محمد یٰسین صاحب الہ آبادی، مولانا محمد فاروق صاحب الہ آبادی اور دوسرے حضرات پہونچنے لگے، انھیں میں لگے لپٹے مولانا جامی صاحب بھی فتح پور پہونچے۔ ایک فتحپور چھوٹا تو دوسرا فتحپور منتخب ہوا، یہ فتحپور دیہات تھا، کوردہ تھا، دشوار گزار تھا، مگر علوم و معرفت کا فتح باب یہیں سے ہونا مقدر تھا، اور لوگ تو آتے رہے جاتے رہے، فیض حاصل کرتے رہے، دوسروں کو فیض پہونچاتے رہے لیکن جامی صاحب پر حضرت کی نگاہ انتخاب پڑگئی، انھیں اپنے پاس ٹھہرا لیا، جامی صاحب جو سراپا اطاعت تھے انھیں عذر ہی کیا ہوسکتا تھا۔

یہاں جامی صاحب کی زندگی کا وہ دور شروع ہوتا ہے جہاں سے ان کی اپنی زندگی اپنی خواہش اور ارادے والی زندگی فنا ہوگئی، اب زندگی ان کی زندگی نہ تھی ان کے شیخ کی زندگی تھی، اور وہی زندگی ان کی اپنی زندگی تھی، ان کے ارادوں کو ان کے خیالات کو ان کے حالات کو اب شیخ کے احوال و سوانح سے الگ کر کے دیکھا اور بیان نہیں کیا جاسکتا۔

جہاں تک مجھے یاد ہے جامی صاحب نے فرمایا تھا کہ انھیں حضرت مولانا کی صحبت بابرکت میں مستقلاً قیام کا شرف لگ بھگ ۱۹۵۰ء سے حاصل ہے، گویا ۵۰ء سے ۱۹۶۷ء تک تقریباً ۱۸/سال ان کی حیات کا وہ حصہ ہے جو حضرت مولانا کی حیاتِ طیبہ میں ضم ہے، جو صاحب ان کی زندگی معلوم کرنا چاہیں وہ حضرت مولاناؒ کی زندگی کا

مطالعہ کریں۔ سفر ہو یا حضر، خلوت ہو یا جلوت ہر جگہ جس شخص کا وجود مولانا کے ساتھ لگا ہوا نظر آئے گا وہ جامی صاحب ہوں گے۔ وہ مولاناؒ کے کاتب خاص ہیں، وہ مولانا کے مدرسہ میں مدرس ہیں، وہ مولانا کے یہاں مفتی ہیں، طالبین وسالکین اور حضرت کے درمیان واسطہ ہیں، غرض مولاناؒ کے معتمد خاص ہیں، اس اجمال کی مختصر سی شرح کردینی ضروری ہے۔

تحریر ملفوظات:

حضرت مولاناؒ نے طالبین وذاکرین کی اصلاح وتربیت کے لئے فتحپور میں جو اصلاحی نظام قائم کیا تھا وہ ٹھیک اسی طرز اور دستور کے مطابق تھا جو اپنے شیخ حضرت حکیم الامتؒ کے یہاں دیکھ چکے تھے۔ آپ کی خدمت میں آنے والے ہر طبقہ کے لوگ تھے، ابتداءً علماء نے آپ کو پہچانا اور آپ سے کسب فیض شروع کیا، اس کے بعد عوام کا بھی ہجوم ہونے لگا، یہ لوگ خانقاہ میں کئی کی روز تک مقیم رہتے اور شیخ کے انفاس طیبہ سے ایمان وعمل میں تروتازگی کا سامان حاصل کرتے، دن میں ایک وقت مجلس ہوتی۔

یہ مجلس عموماً بعد نماز ظہر ہوتی تھی جس میں اطراف ونواح کے طالبین آکر شریک ہوتے تھے، حضرت مولانا اس مجلس میں وعظ فرماتے تھے مگر اس وعظ کو عام جلسوں کے مواعظ پر قیاس نہیں کرنا چاہئے، حضرت کی مجالس میں تسلسل کے ساتھ لچھے دار تقریروں کا گذر نہیں تھا جن میں فصاحت وبلاغت کے دریا بہائے جاتے ہیں۔ حضرت کے پیش نظر مخاطبین کی اصلاح تھی اس لئے خود مشقت برداشت کرکے علماء متقدمین کی کتابوں سے مناسب اور برمحل مضامین محفوظ رکھتے مجلس میں وہ کتابیں تپائی پر یا الماری میں رکھی رہتیں جو مضمون بیان کرنا ہوتا اپنی طرف سے کہنے کے بجائے انھیں کتابوں سے پڑھ کر سناتے، اس کی توضیح وتشریح کرتے اور اسی ذیل میں اصلاحی

ارشادات بھی فرماتے جاتے۔

ان مجالس میں ایک طرف علمی مضامین کی بہتات ہوتی جن سے علماء محظوظ اور قائل ومعترف ہوتے، تو دوسری طرف اس قدر تاثیر وجاذبیت ہوتی کہ ہر شخص اصلاح حال اور حصول روحانیت کے لئے بے چین ہوجاتا، مجلس میں باریاب ہونے والوں کی متواتر شہادت ہے کہ وہاں سے اٹھنے کے بعد نمایاں طور پر قلب میں نورانیت، گناہوں پر ندامت، خوف وخشیت الٰہی میں شدت اور یقین وایمان میں اضافہ محسوس ہوتا، اور وہ اپنی زندگیوں میں ایک خوش گوار تبدیلی پیدا کرنے کا نیا جذبہ وحوصلہ اپنے قلوب میں موجزن پاتے اور وہیں سے یکا یک زندگی کا دھارا دنیا سے مڑکر آخرت کی طرف بہنے لگتا، یہ عام تاثیر تھی۔

اور علماء کی یہ کیفیت ہوتی کہ وہ حضرات مولاناؒ کے علوم ومعارف کو حیرت سے سنتے، کہ یہی کتابیں ہم بھی پڑھتے پڑھاتے ہیں مگر ان سے یہ علوم ومعارف ہمیں دستیاب نہیں ہوتے اور نہ یہ نکتے ذہن میں آتے، جو یہاں سادگی اور برجستگی کے ساتھ بیان ہوجاتے ہیں۔

ان مجالس میں شریک ہونے والے علوم ومعارف سے محظوظ ہوتے، ان کا کچھ حصہ دوسروں کو سناتے تو وہ بھی متأثر ہوتے، دلوں میں خیالات آتے، ارادے ہوتے کہ انھیں مجلس ہی میں قلم بند کرلیا جائے تو ان کا افادہ عام ہوجائے، حضرتؒ سے اجازت چاہی جاتی تو آپ کسی طرح راضی نہ ہوتے، فرماتے کہ حضرت تھانوی کے مواعظ وملفوظات کیا کم ہیں کہ کسی اور کے مواعظ کو ضبط تحریر میں لایا جائے، لیکن بالآخر اصرار کرنے والوں کا اصرار غالب رہا، حضرت مولانا ظہور الحسن صاحب کسولویؒ نے کچھ اس انداز سے اس کی ضرورت ظاہر کی کہ حضرتؒ کو راضی ہونا پڑا، ملفوظات کے ضبط وتحریر کا کام ابتداءً کس نے کیا اور پھر کون حضرات یہ کام کرتے رہے اس کی تفصیل تو

پیش نظر نہیں ہے، لیکن بالآخر یہ کام جامی صاحب پر آ کر ٹھہرا۔

حضرت کی مجلس میں ایک طرف جامی صاحب بیٹھے بہت تیزی سے ملفوظات لکھتے رہتے، تیز اور مختصر اشارات میں لکھنے کی جامی صاحب کو اس قدر مشق ہوگئی تھی کہ کوئی بات چھوٹنے نہیں پاتی تھی ۔مجلس میں جو کچھ لکھتے تھے وہ اشارات ہوتے تھے اور تیزی سے لکھنے کی وجہ سے ان کی تحریری کا انداز بھی بدل گیا تھا، جامی صاحب کی پچھلی تحریریں اس وقت میرے پیش نظر ہیں ان کا خط بہت اچھا، صاف اور واضح تھا، نقطے اور شوشے مکمل ہوتے تھے لیکن تیزی تحریر کا یہ اثر پڑا کہ اطباء قدیم کی طرح بے نقطے اور بے شوشے کے حروف لکھنے لگے، جنھیں وہ تو آسانی سے پڑھ لیتے مگر دوسروں کے لئے کسی طرح ممکن نہ ہوتا، بلکہ جو اشاراتی الفاظ وہ مجلس میں لکھے ہوتے انھیں صاف کرنے میں کچھ مدت کی تاخیر ہو جاتی تو انھیں بھی خاصی دقت پیش آتی، کیونکہ مضمون ذہن سے نکل چکا ہوتا۔ فرماتے تھے کہ حضرت کا جو وعظ میں مجلس میں قلم بند کرتا اسے جلد سے جلد صاف کر لینے کی کوشش کرتا، کیونکہ اس وقت تک مضامین ذہن میں تازہ ہوتے تھے، اگر کسی مضمون کے صاف کرنے میں دیر ہو جاتی اور مہینہ دو مہینہ گزر جاتا تو اسے صاف کرنا مشکل ہوتا، لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ جامی صاحب بدخط تھے، تحریر ان کی نہایت عمدہ اور پختہ تھی ،اور یہ پختگی اس وقت بھی باقی رہتی جب وہ نقطے اور شوشے ترک کر دیتے جس کی وجہ سے اس کا پڑھنا دشوار نہ ہوتا، بالکل یکساں لکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ جن کو ان کی تحریر کا اندازہ ہو جاتا وہ بآسانی پڑھ لیا کرتے تھے، کاتب صاحب جو ''معرفت حق'' اور ''وصية العرفان'' کی کتابت کیا کرتے تھے وہ بے تکلف پڑھ لیتے تھے۔ جب تک ٹیپ ریکارڈ نہیں آیا تھا جامی صاحب ہی حضرت کے مواعظ اور ملفوظات کو قلم بند کرتے رہے، ان کا بڑا حصہ رسالہ معرفت حق میں شایع ہو چکا ہے۔

حضرت کے یہ مواعظ چونکہ مسلسل تقریر کی شکل میں نہ ہوتے تھے بلکہ درمیان

درمیان میں کتابوں کے حوالے بھی آتے رہتے، ایک بات مکرر سہ کرر بھی بیان کرتے، کسی بات پر زیادہ زور دینا ہوتا تو اسے بار بار فرماتے، دوران مجلس میں کوئی صاحب علم اور صاحب ذوق آجاتا تو اسے پچھلی باتیں پھر سناتے، اور پھر طالبین کی گرفت اور ان کے کسی حال وعمل پر مواخذہ اور سوال وجواب بھی ہوتا رہتا، ایسی حالت میں تقریر کا ضبط کرنا اور اسے مرتب کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔

حضرت نے جامیؔ صاحب کو اجازت دے رکھی تھی کہ تقریر صاف کرنے کے دوران عبارتوں میں ربط پیدا کرنے کیلئے اگر کچھ الفاظ اور جملوں کو بڑھانا پڑے یا مکررات کو حذف کرنا پڑے تو کردیا کریں بشرطیکہ مفہوم ومطلب میں کوئی تغیر نہ ہو۔ جامی صاحب حضرت کے اس طرح مزاج آشنا اور اداشناس ہوگئے تھے کہ ٹھیک ٹھیک حضرت کی منشاء ادا کردیا کرتے تھے، اسی لئے حضرت کو ان پر اعتماد تھا، پڑھنے والا کہیں سے اندازہ نہیں کرسکتا کہ حضرت کی عبارت میں پیوند کہاں لگا ہے۔

بلکہ جامی صاحب کی اپنی تحریریں بھی حضرت کے رنگ میں اس قدر ڈوبی ہوئی ہیں کہ حضرت کے مواعظ وملفوظات کے مذاق آشنا ان میں حضرت ہی کا رنگ دیکھتے ہیں۔

فنائیت کی یہی وہ ادا تھی جس نے انھیں حضرت کا خاص معتمد بنادیا تھا، حضرت نے ان کی تربیت بھی اسی انداز پر کی تھی کہ وہ حضرت کے علوم ومعارف کے اداشناس ونکتہ رس بن گئے تھے۔

یہاں حضرت مصلح الامت کے خلیفہ مجاز حضرت مولانا قاری حبیب احمد صاحب الہ آبادی دامت برکاتہم کا ایک ارشاد ذکر کرنا مناسب ہے، ایک مجلس میں انھوں نے مولانا جامی صاحب کا ذکر نہایت محبت اور انہماک کے ساتھ کیا دوران تذکرہ فرمایا کہ:

''حضرت کبھی کبھی مجلس میں ارشاد فرماتے ہیں کہ فلاں صاحب سے میں نے کیا کہا آپ اسے لوگوں کو سمجھائیے، حضرت کے رعب وجلالت علمی کو جو عالم تھا کم کسی عالم کی ہمت ہوتی تھی کہ وضاحت سے بیان کرتا، لوگ بیان کرنے کھڑے ہوتے کوئی ایک بات بیان کرکے خاموش ہوجاتا کوئی دوچار باتیں ذکر کرتا، غرض پورا مضمون کسی کے بس کی بات نہ تھی کہ بیان کرسکتا، آخر میں حضرت مولانا فرماتے کہ جامی صاحب آپ بیان کیجئے! جامی صاحب اپنے مخصوص مودبانہ انداز میں چشمہ درست کرتے کچھ گلا صاف کرتے، ہاتھ میں کاغذ ہوتے انھیں سمیٹتے اور پھر اطمینان سے اٹھتے اور حضرت کی باتیں تقریباً حضرت ہی کے انداز میں دہرانا شروع کرتے اور درمیان میں بعض باتوں کی شرح بھی کرتے جاتے، حضرت قاری صاحب فرماتے تھے کہ جس ترتیب سے حضرت نے باتیں ارشاد فرمائی ہوتیں ٹھیک ٹھیک اسی ترتیب سے ازاول تا آخر بیان کرتے اور کوئی بات چھوٹنے نہ پاتی -- مولانا جامی صاحب اپنی تشریحات کو ازراہ ظرافت بعد میں فرماتے کہ کہیں کہیں ''شرح جامی'' کی ضرورت ہوتی ہے۔

حضرتؒ بہت انبساط سے سنتے اور خوش اور مطمئن ہوتے۔''

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

باب ۹

بارگاہِ مصلح الامت میں (۲)

جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت مجلس میں اپنے اکابر اور متقدمین کی کتابوں کے حوالے بکثرت دیا کرتے تھے، کتابوں پر حضرت کی نظر اچھی تھی، کتابوں کے خاص خاص مضامین بیان کرتے کرتے کسی کتاب کی ضرورت ہوتی تو وہ کتاب اٹھاتے، اس میں ضرورت کا مضمون نکالتے اسے سناتے، ابتداءً یہ کام وہ خود کیا کرتے تھے، حضرت کا حافظہ بے حد قوی تھا یہ مضامین حضرت کو زبانی یاد ہوتے مگر کتاب میں دیکھ کر سناتے، بعد میں جب علماء بکثرت مجلس اور صحبت میں رہنے لگے تو ان سے کتاب طلب فرماتے اور انھیں حکم دیتے کہ فلاں مضمون نکالو، اول تو بہت سے لوگوں کو کتاب سے مناسبت نہ ہوتی، اور مناسبت ہوتی بھی تو منشاء کے سمجھنے میں غلطی ہو جاتی اور جو حضرات حضرت کے رعب وجلال کا منظر دیکھے ہوئے ہیں ان سے پوچھئے کہ حضرت کے سامنے عجلت میں کسی مضمون کا کھوج نکالنا کتنا مشکل کام تھا، یہ نقشہ تصور میں لائیے کہ حضرت کسی مضمون کو ایک کیف وحال اور جوش وجذبہ کے ساتھ بیان کر رہے ہیں، اس کی تائید میں اکابر علماء کی تحریریں ان کے حافظہ میں موجود ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ مخاطب کے دل میں بات اتار دیں، اس مضمون کو مثلاً صاحب فتح الباری نے کہیں لکھا ہے، فتح الباری کی تیرہ ضخیم جلدیں ہیں، حضرت حکم دیتے ہیں کہ فتح الباری اٹھاؤ، اب وہ غریب کون سی جلد اٹھائے، اور اگر وہ صحبت میں بکثرت رہنے کی وجہ سے اتنی مناسبت

پیدا کر چکا ہے کہ کس جلد میں ہے تو کون سا صفحہ نکالے، حضرت انتظار میں ہیں یہ غریب الٹ پلٹ کر رہا ہے اسے مضمون مل ہی نہیں رہا ہے، حضرت فرمارہے ہیں کہ علوم سے مناسبت نہیں ہے، پھر کتاب ہاتھ میں لیتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کے سامنے خود ہی وہ مضمون کھل کر سامنے آگیا، یہ منظر روزانہ دیکھا جاتا، حضرت چاہتے تھے کہ حضرات اہل علم کو کتابوں سے مناسبت ہوجائے خود بھی استفادہ کریں اور دوسروں کو بھی فائدہ پہونچائیں۔ اس سلسلہ میں اہل علم کی خوب اصلاح ہوتی، ان کا مواخذہ ہوتا اس لئے حاضر باش علماء ہمیشہ چوکنا اور حاضر دماغ رہتے اور انھیں کتابوں سے اور علوم سے خوب مناسبت پیدا ہوجاتی۔

اس امتحان میں سب سے کامیاب جو شخصیت تھی وہ جامی صاحب کی تھی، جامی صاحب مجلس میں سراپا گوش بنے بیٹھے رہتے، حضرت کے ایک ایک لفظ پر دھیان جمائے رہتے، ادھر حضرت کے منھ سے کسی کتاب کی فرمائش نکلی ادھر بجلی کی سی تیزی سے وہ کتاب اس کا ٹھیک وہی صفحہ جو مقصود ہوتا کھول کر حضرت کے سامنے رکھ دیتے، دیکھنے والے حیران رہ جاتے کہ کس درجہ مزاج شناس ہیں اور کیسی ان کی یادداشت ہے۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ حضرت بیان کرتے کرتے فرماتے کہ اس مضمون کو مثلاً شاہ ولی اللہ صاحب نے یا صاحبؒ فتح الباریؒ نے یا حضرت مولانا تھانویؒ نے خوب لکھا ہے، جامی صاحب کتاب اٹھایئے! کون سی کتاب؟ کون سی جلد؟ شاہ صاحب کی بہت سی کتابیں ہیں، مولانا تھانوی کی بہت سی کتابیں ہیں، لیکن حضرت سمجھتے تھے کہ اس تفصیل کی ضرورت نہیں ہے، جامی صاحب فوراً اٹھتے اور ٹھیک وہی کتاب اٹھالاتے اور اس کا وہی صفحہ کھول کر رکھ دیتے جس کی ضرورت ہوتی، لوگ کہتے کہ جامی صاحب کو شاید کشف ہوجاتا ہے۔

جامی صاحب فرماتے تھے کہ حضرت جن مضامین اور جن کتابوں کے حوالے

بکثرت دیتے تھے میں ان کے اشارات، کتاب، جلد اور صفحہ کے حوالے کے ساتھ نوٹ کرلیا کرتا اور اہتمام سے انھیں یاد رکھتا، مجلس میں جب وہ مضمون بیان ہوتا تو طبیعت مستعد ہو جاتی کہ ابھی اس کی طلبی ہوگی چنانچہ ایسا ہی ہوتا اور میں اسے حضرت کی خدمت میں پیش کر دیتا۔ تاہم یہ کام بھی آسان نہ تھا جس کو حضرت کے رنگ طبیعت سے مناسبت نہ ہوتی وہ ہرگز اس کام کو نہیں کر سکتا۔ کبھی کبھی جامی صاحب سے بھی چوک ہو جاتی تو ان کی بھی تادیب ہوتی، اس لئے دماغ کو ہر وقت تیار اور مستعد رکھنا پڑتا۔

حضرت مصلح الامت نے متعدد کتابیں اور رسائل تالیف فرمائے ہیں، لیکن ان کا تالیفی طرز عام مصنفین جیسا نہ تھا، آپ نے بطور خود کوئی کتاب تحریر نہیں فرمائی ہے، حضرت کے یہاں مجلس میں وعظ کا دستور تھا یہ مجلسی مواعظ کبھی کبھی کسی ایک موضوع پر ہفتوں ہوتے رہتے، انھیں کو قلمبند کر کے کتابی صورت میں شائع کیا جاتا، یہ مضامین قیدِ تحریر میں لاکر حضرت کے ملاحظہ میں لائے جاتے، حضرت ان کی اصلاح فرما کر طباعت و اشاعت کی اجازت عطا فرماتے۔

یہ خدمت زیادہ تر بلکہ تقریباً تمام تر جامی صاحب ہی سے متعلق تھی، مجلس میں وعظ قلمبند کرنا، مجلس کے بعد اسے صاف کرنا، کتابی ترتیب پر اسے ڈھالنا، حضرت کی نظر اصلاح سے گزارنا، یہ سب کام جامی صاحب انجام دیا کرتے تھے، غالباً ابتداء کے چند ایک رسائل دوسرے حضرات کی کاوش و کوشش کا نتیجہ ہیں پھر جو کچھ ہے وہ جامی صاحب ہی کا کارنامہ ہے۔

معرفت حق اور وصیۃ العرفان:

حضرت کی حیات کے آخری تین چار برسوں میں حضرت کے علوم و معارف کی عام اشاعت کیلئے لوگوں نے ایک ماہنامہ رسالہ ''معرفت حق'' نکالنا طے کیا۔ رسالوں کے اجراء کے لئے کئی قانونی ہفت خواں طے کرنے پڑتے ہیں، پھر ان کے

مندرجات ومضامین کی جوابدہی، سرکاری دفتروں میں ان کی ضروری کارروائی ایک مستقل دردسر ہے، اس لئے قانونی طور پر اس کے مدیر دوسرے صاحب بنائے گئے، مگر اس کی ترتیب وتہذیب، اس کی طباعت واشاعت کی تمام تر ذمہ داری جامی صاحب کے سر تھی، نام کسی اور کا ہوتا لیکن خاموشی کے ساتھ سارا کام وہ انجام دیتے، حضرت کے وصال کے بعد مواعظ وملفوظات کا بڑا ذخیرہ جامی صاحب کے پاس محفوظ تھا۔ رسالہ حضرت کی وفات کے بعد بھی نکلتا رہا اور حضرت کے مضامین آب وتاب کے ساتھ چھپتے رہے، وفات کے تقریباً دس گیارہ سال بعد تک یہ ماہنامہ ''معرفت حق'' ہی کے نام سے نکلتا رہا، اس کے بعد کچھ نزاع اور قانونی مجبوری کی وجہ سے ''وصیۃ العرفان'' کے نام سے جاری کیا گیا، اب ادارت کے لئے ایک دوسرے بزرگ کا نام تجویز کیا گیا لیکن سارا کام جامی صاحب ہی انجام دیا کرتے، اس طرح جامی صاحب کی کوشش وکاوش سے حضرت کے علوم کا ایک عظیم الشان ذخیرہ منظر عام پر آ گیا۔

اب کوئی چاہے تو ''معرفت حق'' اور ''وصیۃ العرفان'' کے مضامین کو مرتب کر کے ''مجالس مصلح الامت'' کے نام سے شائع کر سکتا ہے۔ امت کیلئے یہ نہایت مفید اور کارآمد ذخیرہ ہوگا۔ حضرت مولانا کے مواعظ میں ایسی تاثیر اور کشش ہے کہ اس کی مثال کم ملے گی، یکا یک آدمی کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔

تالیفات مصلح الامت:

حضرت کی تالیفات کل باون (۵۲) رسائل ہیں، جن میں سے بعض مختصر اور بعض مفصل ہیں، ان میں بجز چند ایک کے سب الگ الگ حضرت کی حیات مبارکہ میں شائع ہو چکے تھے لیکن بعد میں ان میں اکثر نایاب ہو گئے۔

اہل خانقاہ بالخصوص حضرت مولانا قاری محمد مبین صاحب دامت برکاتہم کو خیال ہوا کہ ان رسائل کو یکجا شائع کر دیا جائے تو یہ محفوظ بھی ہو جائیں اور ان سے

استفادہ بھی سہل ہو جائے، چنانچہ اس کی ذمہ داری بھی مولانا جامی صاحب کے سر ڈالی گئی، انھوں نے یہ کام باحسن وجوہ انجام دیا، چار جلدوں میں ۴۸؍رسالے بنام ''مجموعہ تالیفات مصلح الامت'' شائع کئے گئے، خدا جانے کیا رکاوٹ پڑی کہ پانچویں جلد ابھی تک شایع نہیں ہو سکی۔ اللہ تعالیٰ اس کا انتظام فرمادیں۔ (**حاشیہ طبع جدید**: پانچویں جلد حضرت مولانا قاری ولی اللہ صاحب مدظلۂ، امام مسجد نور ڈونگری، بمبئی کے حکم سے اس خاکسار مولف نے ترتیب دی، اور حضرت قاری صاحب نے اسے شائع کیا)

جامی صاحب بحیثیت مدرس:

حضرت مولانا نے اپنی خدمت میں جامی صاحب سے تدریس کی خدمت بھی لگا رکھی تھی، چنانچہ جو لوگ حضرت کے یہاں طلب علم کے لئے حاضر ہوتے جامی صاحب بھی حسب گنجائش وضرورت انھیں پڑھاتے، حضرت کے وصال کے بعد بھی جب تک بالکل مجبوری نہیں ہو گئی ہمیشہ کئی کئی اسباق پڑھاتے رہے، بیمار رہتے، لیٹے رہتے مگر اسباق چلتے رہتے، جامی صاحب اکثر منتہی طلباء کو پڑھاتے، استعداد بہت عمدہ تھی، سمجھانے کا ملکہ خوب تھا چونکہ طبیعت میں خاصی ظرافت بھی تھی اس لئے سبق بہت دلچسپ ہوتا۔

جامی صاحب بحیثیت مفتی:

حضرت اقدس نے خانقاہ میں مسائل بتانے کی ذمہ داری بھی جامی صاحب کے سپرد کر رکھی تھی، لوگ تحریراً یا تقریراً یا تو حضرت سے مسائل پوچھتے یا جامی صاحب سے، حضرت کے یہاں جو اعلان آویزاں تھا اس کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ:۔

> ''یہاں کے آنے جانے والے حضرات اثناء قیام میں مسائل صرف حضرت والا مدظلۂ العالی سے دریافت کریں یا مولوی جامی صاحب سے پوچھ لیں، کسی تیسرے سے پوچھنے کی اجازت نہیں ہے۔ (حیات مصلح الامت، ص:۱۲۹)

حضرت کے وصال کے بعد بھی مدرسہ وصیۃ العلوم الہ آباد میں فتوی نویسی کا کام مولانا جامی سے متعلق تھا۔

شیخ ومرید کے درمیان واسطہ:

حضرت مصلح الامت نور اللہ مرقدہٗ کبھی کبھی اپنے متعلقین ومریدین کی کسی غلطی پر گرفت فرماتے تو براہ راست ان سے کچھ نہ کہتے بلکہ کسی فہیم آدمی کے واسطے سے کہلواتے اس میں بڑی حکمتیں تھیں۔ اول تو یہ کہ حضرت کے رُعب وجلال اور روحانی طاقت سے مرعوب ہوکر بعض اوقات لوگ اپنی پوری بات کہہ نہیں پاتے تھے، بلکہ کچھ کا کچھ کہہ جاتے، اس سے حضرت کو ناگواری اور تکدر ہوتا، دوسرے یہ کہ ایسا بھی ہوتا کہ حضرت کے کلام کو سمجھ نہ پاتے اور غیر متعلق جواب دینے لگتے، کبھی حضرت کا کلام عالی ہوتا یا مجمل ہوتا اس سے بھی دقت پیش آتی، کبھی خود حضرت کو ناگواری ہوتی اور بالمشافہ گفتگو کو طبیعت آمادہ نہیں ہوتی، یا ایسا خیال فرماتے کہ تکدر کی حالت میں گفتگو کرنا مرید کیلئے باعث ضرر ہوگا، کبھی کسی کو کوئی بات سمجھاتے لیکن وہ اپنی کم فہمی کے باعث بات سمجھ نہ پاتا، کبھی کسی صاحب علم یا ذی وجاہت شخص سے ان کے نفع کی کوئی بات کہنا چاہتے مگر براہ راست تخاطب سے کوئی لحاظ مانع ہوتا، ان سب وجوہ سے حضرت کبھی کبھی اپنے خاص لوگوں کو واسطہ بناتے ا، گروہ واسطہ فہیم اور حضرت کی منشاء سمجھنے والا ہوتا تو نہایت خوش اسلوبی سے مقصد حل ہوجاتا، لیکن کبھی کبھی ان واسطوں سے غلطی ہوجاتی تو ان کا بھی مواخذہ ہوجاتا، اس مقصد کے لئے بس خاص خاص لوگ ہی منتخب کئے جاتے۔ حضرت مولانا جامی صاحب ان معتمد ترین لوگوں میں سے تھے جو حضرت کے منشاء کو کماحقہٗ ادا کردیا کرتے تھے، اس باب میں ان کی شخصیت معروف تھی، ان کے علاوہ بھی بعض حضرات تھے جو بہت کامیاب تھے مگر جامی صاحب کا مقام نمایاں تھا۔

جامی صاحب فرماتے تھے کہ ایک سرکاری ملازم جو ریٹائر ہوچکے تھے حضرت

کے یہاں عرصہ تک مقیم رہے، ذاکر وشاغل تھے ایک مرتبہ گھر جانے کیلئے انھوں نے حضرت سے درخواست کی اور اس کے لئے ایک تحریر پیش کی، حضرت نے اسے دیکھا تو پاس میں ایک صاحب علم موجود تھے حضرت نے وہ تحریر انھیں دیتے ہوئے فرمایا کہ انھیں سمجھائیے، وہ بیچارے حضرت کا مطلب نہ سمجھ سکے کچھ غیر متعلق باتیں سمجھانے لگے، حضرت نے جامی صاحب کو بلوایا اور تحریر ان کے حوالہ کر کے فرمایا کہ انھیں سمجھائیے، جامی صاحب نے وہ تحریر دیکھی تو اس میں لمبے چوڑے دلائل سے گھر جانے کی ضرورت بیان کی گئی تھی، جامی صاحب نے فرمایا کہ ارے صاحب! یہ آپ نے کیا کیا؟ یہاں کوئی سرکاری ملازمت ہے کہ اتنی وجوہات بیان کرنے کی ضرورت ہو! آپ تو مختصر لفظوں میں حضرت سے گھر جانے کی اجازت لیجئے، ایسی لمبی چوڑی درخواست شیخ کے حق میں بے ادبی کی بات ہے، حضرت اقدس کھل اٹھے اور فرمایا کہ ہاں میں یہی چاہتا تھا، اس قسم کے واقعات بہت ہیں کتنے ہی بگڑے معاملات جامی صاحب کے حسن وساطت سے بن جاتے تھے۔

◆ ◆ ◆ ◆ ◆

باب ۱۰

سفرِ حج اور حضرت کا وصال

حضرت مولانا نے ۱۹۶۷ء میں سفرِ حج کا قصد کیا، تو جہاں اپنی دونوں صاحبزادیوں اور دامادوں کو ساتھ لیا، وہیں جامی صاحب کو بھی اپنی رفاقت و معیت میں رکھا، یہ مبارک سفر ان حضرات کے لئے خوشیوں اور سعادتوں سے معمور تھا، کہ ایسے بڑے اللہ والے کے ساتھ حج کا شرف حاصل ہوگا، لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا، جہاز میں ہی حضرت کا وصال ہوگیا، حضرت کے وصال کے بعد ان حضرات پر کیا گذری اس کی تفصیل دیکھنی ہو تو کتاب ''حیات مصلح الامت'' کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اس موقع پر جامی صاحب نے جو خط لکھا وہ قابل ملاحظہ ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

> تمنا اگرچہ محال کی بھی جائز ہے، تاہم اپنے حج کی تمنا کیا، تصور میں بھی کبھی اس کا خیال نہیں کر سکا تھا، مگر بقول قائل ؎
>
> بود مورے ہوسے داشت کہ بکعبہ رسد
> دست بر پائے کبوتر زد و ناگاہ رسید
>
> ایک چیونٹی کی یہ خواہش ہوئی کہ کعبہ شریف میں پہونچ جائے، تو اس نے ایک کبوتر کا پاؤں پکڑ لیا اور بیت اللہ تک پہونچ گئی۔
>
> اللہ تعالیٰ کے فضل اور حضرت والا کے کرم سے وہ دن آیا کہ آپ لوگوں کو ساحل پر غرقِ حسرت کئے ہوئے ہم لوگ روانہ ہوئے، حاجیوں کے جہاز نے لنگر

اٹھادیا۔ عجب منظر تھا، حضرت والا کرسی پر باہر جلوہ افروز تھے اور سب لوگ ٹکٹکی باندھے حضرت کو دیکھ رہے تھے، حضرت بھی مغموم تو تھے، مگر محبین کے مجمع کے اور ان کی محبت کے مظاہرے سے مسرور بھی تھے۔ میں بھی محوِ حیرت بنا کرسی کے پاس کھڑا تھا کہ یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے، غم و سرور کا ایسا سخت مقابلہ تھا کہ دونوں ہی قسم کے آنسو خشک تھے۔

جہاز چھوٹا یا حضرت چھوٹے، جہاز گھوما تو کمرہ کی کھڑکی سے پھر ساحل کا مجمع نظر آیا، آپ جس طرح دیکھتے تھے، حضرت بھی دیکھتے رہے۔ فرماتے تھے اب کیا نظر آتا ہوگا، اور یہاں بھی بھیڑ ہی نظر آرہی ہے، تشخصات تو غائب ہو گئے، اور ذرا آگے بڑھے تو بس اس کا مصداق تھا۔

مڑکر جو میں نے دیکھا امید مرچکی تھی
پٹری چمک رہی تھی گاڑی گذر چکی تھے

تھوڑی دیر میں ساحل پانی کی اوٹ میں تھا۔

بھائی سلیمان صاحب امیر الحج مقرر ہوئے، کسی نے عصر کی اذان دی، چار چھ جگہ جماعتیں ہوئیں۔ ہم لوگوں نے ڈی لکس کے ہال میں حضرت والا کے ساتھ نماز پڑھی (حضرت نے اس کے بعد) مغرب پڑھی، عشا پڑھی۔ دوا تیل سب معمول پر آگئے، صبح حاضر ہوا یعنی پنجشنبہ کی صبح ۲۳؍ نومبر کو فرمایا نیند خوب آئی طبیعت اچھی ہے۔ سمندر جو ملا تو اوپر ہی جہاں حضرت کرسی پر بیٹھے تھے کرسی رکھ کر ہاتھ میں تسبیح لے کر اکثر بیٹھا رہتا، کبھی وہیں تلاوت کرتا، حضرت نے لوگوں کو بلایا نہیں، دوا کیلئے جاتا تھا، ذرا دیر بیٹھ کر چلا آتا تھا، کبھی کبھی حاجی جی (حاجی الیاس صاحب بمبئی والے) سے فرماتے کہاں جارہے ہو حاجی جی؟ انھوں نے کہا کمرے میں جارہا ہوں۔ فرمایا نہیں، یہ نہیں کہہ رہا ہوں، کہاں چل رہے ہو،

سمجھے؟ جی ہاں سمجھا، ہاں۔

پنجشنبہ کو دوپہر کو مجھے بلوایا اور دو بات فرمائی، فرمایا کہ تم نے بمبئی میں کیا دیکھا، اور یہاں کیا دیکھ رہے ہو؟ ان سب باتوں کو لکھو شاید کسی اللہ کے بندے کو کچھ نفع ہو، تم کو اسی لئے ساتھ لایا ہوں۔ اس کے بعد فرمایا کہ لوگوں کے سامنے کتاب سے حج کے مسائل بیان کرو۔ کچھ وقت اس میں گذرے، لوگوں کو علم ہو جائے گا۔ میں نے عرض کیا بہت اچھا، کل سے اسی وقت بیان کروں گا۔ چند اوقات نماز ہونے کے بعد حضرت کا، اور جماعت ہونے کا پھر قاری صاحب کی قرأت کا، جوں جوں علم ہوتا گیا، یہاں کی جماعت کا مجمع بہت بڑا ہو گیا۔

آج بھی حضرت اچھے رہے، شب جمعہ اچھی گذری، جمعہ کو ظہر سے ذرا پہلے مجھے بلوایا، فرمایا کہ احرام وغیرہ کا مسئلہ ذرا ٹھیک سے بیان کرنا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت معلم الحجاج سے سنانے کا خیال ہے، اول تو اس میں جدہ سے احرام کا مسئلہ ہے ہی نہیں، دوسرے ابتداء میں آداب وغیرہ کا ذکر ہے، اور میں نے سوچا ہے یوں کہہ دوں گا کہ مولانا شیر محمد صاحب کی یہ تحقیق ہے اور حضرت کو اس پر اطمینان ہے، باقی جس کو تردد ہو وہ شبہہ میں نہ پڑے، یلملم ہی سے باندھ لے، کیونکہ احرام کی تقدیم تو بہر حال جائز ہے اور جو آسانی چاہتا ہے اور ہم پر اعتماد کرتا ہے تو مسئلہ یہی صحیح ہے، چنانچہ ہم بھی احرام جدہ ہی سے باندھیں گے، فرمایا کہ ہاں ٹھیک ہے۔ بس اس کے علاوہ مجھ کو نہیں بلایا اور شاید کسی کو بھی نہیں بلایا۔ بس کھڑکی سے سمندر اور پانی ہی کو برابر دیکھتے رہے، کبھی کبھی ادھر سے کوئی آدمی گذرتا تو کھڑکی ہی سے مصافحہ کر لیتے۔

جمعہ ۲۴ر نومبر کو عصر کے بعد حسب معمول دوا کھلانے آیا، اس وقت ایک صاحب وکیل نامی مولانا عبید الرحمٰن صاحب (الہ آباد کے نہایت خاموش لیکن

باثر عالم، اللہ کو پیارے ہوچکے) کے شاگرد، حاضر ہوئے اور بیعت کی درخواست کی۔ میں نے سفارشاً عرض کیا، حضرت یہ بھی الہ آباد کے ہیں، مولوی عبیدالرحمٰن صاحب نے آپ ہی کی بابت لکھا تھا، فرمایا اچھا۔ میں نے کہا کسی دن شام کو بیعت ہوجائیں گے، فرمایا ہاں یہ بیعت ہی ہیں۔ یہ فرما کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا تم کو سلسلہ میں داخل کرلیا۔ سبحان اللہ

یہ جوان حضرت والا کے سب سے آخری مرید ہیں۔

اس کے بعد حضرت مصلح الامت نور اللہ مرقدہ کے مرض وفات اور تدفین کی تفصیلات بیان کی ہیں، یہ تفصیلات ''حیات مصلح الامت'' کے صفحات میں بیان کی جا چکی ہیں، ان کے اعادہ کا یہ موقع نہیں ہے، لیکن مناسب ہے کہ اس سفر سعادت کی کچھ روداد خود جامی صاحب ہی سے سن لی جائے، انھوں نے حالات مصلح الامت کے نام سے ذکر محبوب کا جو طویل سلسلہ شروع کیا تھا، اس کا اختتام اسی پُرکیف اور درد وغم سے لبریز داستان پر ہوا ہے۔

یہ قافلہ ۲۲؍نومبر ۱۹۶۷ء کو بروز چہارشنبہ جہاز پر سوار ہوا تھا، ۲۴؍کو حضرت کی وفات ہوئی، ۳۰؍کو سمندر میں تدفین ہوئی، اس کے بعد یہ قافلہ بغیر امیر قافلہ کے جدہ کے ساحل پر اترا، کوشش یہ کی گئی تھی کہ حضرت کے جسد اطہر کو بجائے سمندر میں مدفون کرنے کے مکہ مکرمہ کے قبرستان جنت المعلیٰ میں دفن کی اجائے، اس سلسلہ میں تمام تیاریاں مکمل ہوچکی تھیں، اس وقت کے سعودی حکمراں ملک فیصل رحمہ اللہ کی جانب سے خصوصی اجازت نامہ بھی جاری ہوگیا تھا، مگر جو ہمیشہ دنیا سے اور دنیا والوں سے الگ رہا، جس کی پوری زندگی بادشاہوں کے داغِ منت سے پاک تھی آخر میں کیا کسی بادشاہ کا احسان لیتا، جہاز کے باہر باہر اطلاعات، کوششوں اور مکہ مکرمہ پہونچانے کی تیاریوں کا غل مچا ہوا تھا، اور جہاز میں کوئی اطلاع نہیں آرہی تھی، بالآخر جب جہاز ہی

سے سمندر میں تدفین ہولی تو پے در پے اطلاعات ملنے لگیں کہ حضرت کو مکہ مکرمہ لے جانا ہے، مگر جس نے اپنی زندگی کا آغاز توکل وتبتل کے ساتھ کیا تھا وہ آج بھی بجز خدا کے اور کسی کا زیر بار احسان نہ ہوا۔ جامی صاحب لکھتے ہیں کہ:

’’حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب (مفتی اعظم پاکستان) سے سفرِ حج کے موقع پر ہم لوگوں نے ملاقات کی تو فرماتے تھے بھائی! مولانا وصی اللہ صاحب سے تو ہمارا بچپن کا ساتھ تھا، دیوبند میں ہم دونوں ہم درس رہے، پھر تھانہ بھون میں ہم مشرب وہم مسلک، مولانا کے حالات شروع ہی سے کچھ عجیب نوع کے مشاہدے میں آتے رہے، سب سے الگ تھلگ، مخلوق سے منقطع رہنے کا ایک رنگ جداگانہ رہا کرتا تھا، تھانہ بھون میں بھی اکثر انھیں یہ شعر گنگناتے سنا گیا ؎

ہوئے ہم جو مر کے رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

ان کے اس حال پر مجھے رشک بھی ہوتا اور تعجب بھی ہوتا، لیکن اس وقت تو کچھ بات سمجھ میں آئی نہیں، بلکہ اس کو مولانا کا ایک حال سمجھا، لیکن بعد کے پیش آنے والے واقعات نے یہ ظاہر کر دیا کہ وہ صرف ایک حال نہ تھا بلکہ مخصوص فنائیت کی تمنا تھی جس کا تعلق محض حق تعالیٰ سے محبت کا تھا۔

چنانچہ آپ لوگوں سے کہتا ہوں کہ میں نے جس وقت ریڈیو پاکستان سے مولانا کی موت فی البحر (سمندر میں موت) کی خبر سنی تو ایک دھکا تو ضرور لگا لیکن کچھ استعجاب نہیں ہوا بلکہ مولانا کی وہ دل سے چاہی ہوئی تمنا یاد آکر یہ بات سمجھ میں آئی کہ یہ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے کی مخصوص تمنا کو شرف قبولیت بخشا، اور معاً یہ شعر بھی میرے وردِ زبان ہو گیا کہ ہوا تو ویسا ہی جیسا مولانا کی خواہش تھی ؎

ہوئے ہم جو مر کے رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

> اور ایک یہی کیا مولانا کے اور دوسرے حالات جو ہم لوگوں کے سامنے تھے انھیں دیکھ کر یہ خیال ہوتا تھا کہ دیکھنا چاہئے کہ جس کی ابتداء یہ ہے اس کی انتہاء کیا سامنے آتی ہے۔ (وصیۃ العرفان، نومبر ۱۹۸۹ء، ص:۲۱/۲۲)

بات سے بات نکلتی ہے، یہاں اپنے وقت کے بزرگ ترین شیخ طریقت حضرت مولانا محمد احمد صاحب قدس سرہٗ کی بات یاد آتی ہے، مولانا نے فرمایا کہ حضرت مولانا کی یہ کتنی بڑی سعادت وکرامت ہے کہ از روئے حدیث پاک آپ کو قیامت تک ہر سال حج کا ثواب ملتا رہے گا، اور فرمایا کہ میں جب بس سے الہ آباد کے لئے روانہ ہوا تو ایک رسالہ دیکھ رہا تھا اس میں ساحلِ جدہ کے قریب پہونچ کر کسی وجہ سے سمندر ہی میں تدفین کا واقعہ مذکور تھا، اس کے بعد یہ شعر لکھا تھا کہ ؎

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا

مجھ کو اس موقع پر یہ شعر پسند نہ آیا، اور معاً اللہ تعالیٰ نے یہ اشعار مجھ سے کہلوائے ؎

جوشِ جنوں میں توڑ دیا میں نے خود کمند — دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا
قسمت کی خوبی کہتے ہیں اس کو عزیز من — رحمت کے پر سے اڑ کے سر بام آ گیا

میں اس کا ذکر کر رہا تھا کہ حج کو جانے والا یہ قافلہ جو خوشیوں اور مسرتوں سے معمور ہو کر چلا تھا، اپنے شفیق وکریم رہبر وسرپرست کو کھو کر جدہ کے ساحل پر اترا، درمیان میں حضرت مصلح الامتؒ کا ذکر آ گیا اور ’’لذیذ بود حکایت‘‘ کے مقتضا سے ’’دراز تر گفتم‘‘ سے بچ نکلنا میرے لئے ممکن نہ تھا، اب حج کے احوال وکوائف جامیؔ صاحب کے قلم سے سن لیجئے:

’’ساحل سمندر پر مکہ کے لوگ خصوصاً علماء مکہ کافی تعداد میں موجود تھے، اور حکومت نے جنت المعلیٰ میں دفن کرنے کی اجازت بھی دیدی تھی، مگر مشیّتِ الٰہی کہ سب کچھ ہونے کے باوجود ہم لوگوں کو اطلاع نہ ہوسکی، اگرچہ قدوائی صاحب (سفیر ہند) نے ہمارے تار کا جواب بھی دیا مگر مرضیِ الٰہی وہ تار ہم کو نہیں ملا۔

آگے لکھتے ہیں:

’’ہم لوگ جدہ سے مکہ شریف کے لئے روانہ ہوگئے، ہم سب کا تقریباً ایک ہی سا حال رہا کہ ایک تو حضرت اقدس کا ساتھ چھوٹ جانے کا غم ہم سفر رہا، اور دوسری جانب دیارِ مقدس کی حاضری کی مسرت دامن گیر رہی، مگر کعبہ کی زیارت کا شوق غالب رہا، اور سنا تھا کہ کعبہ شریف دور سے نظر آتا ہے، اس لئے نظر شوق مسلسل اسے تلاش کرتی رہی، مگر یہ پہلے زمانہ کی بات تھی جبکہ نیا حرم اور اونچے مکانات تعمیر نہ ہوئے تھے، بہر حال چالیس میل کا یہ سفر ذرا سی دیر میں طے ہوگیا اور شہر میں داخل ہونے کے باوجود کعبہ شریف نظر نہ آیا، ذرا ہی دیر میں سنگ مرمر کی ایک فصیل سی نظر آئی، ڈرائیور نے کہا ھٰذا حرم کہ یہ حرم شریف ہے، اس کے دو ہی چار منٹ بعد محلّہ اجیاد میں موٹر رُکا اور معلوم ہوا کہ یہیں معلم صاحب کے مکان پر ہم کو اترنا ہے، ہم لوگ اترے، زنانہ سواریاں ایک مکان میں ٹھہرادی گئیں، دوسری جانب ہم لوگوں کو کمرے ملے، سب نے اپنا اپنا سامان سہیج لیا (درست کرلیا) اسی اثناء میں حرم شریف سے جمعہ کی اذان کی آواز آئی، ہم سب تیار تو تھے ہی سیدھے مسجد پہونچے، نیا حرم عبور کیا، اس کے بعد ترکی حرم میں قدم رکھا، وہیں سے کعبہ شریف پر نظر پڑی، ہر شخص اپنے اپنے خلوص کے بقدر متاثر ہوا، اللہ تعالیٰ نے نہ معلوم کیسی کشش اس کے اندر رکھی ہے کہ کیسا ہی سنگدل انسان ہو کعبہ شریف پر نظر پڑنے کے وقت روئے بغیر نہیں رہ

سکتا۔ سچ فرمایا ہے ؎

کعبہ را ہر دم تجلی می فزود   ایں ز اخلاصات ابراہیم بود

یعنی کعبہ پر ہر دم ایک نئی تجلی ہوتی رہتی ہے، یہ سیّدنا ابراہیم ﷷ کی کے اخلاص کی برکت ہے۔

(طواف وسعی سے فراغت کے بعد) حسب توفیق وموقع عمرہ ادا ہوتا رہا تا آنکہ اگلا جمعہ آ گیا۔

سیّد علوی مالکی سے ملاقات: بھائی نور ولی صاحب ہر جمعہ کو جدہ سے آیا کرتے تھے، ان سے میں نے ذکر کیا کہ یہاں کوئی عالم علوی مالکی ہیں؟ والد صاحب ان کی بہت تعریف کیا کرتے تھے اور ان سے بہت گہرے تعلقات تھے، انھوں نے کہا ہاں! نماز جمعہ کے کچھ دیر بعد وہ حرم کے ایک گوشہ میں تقریر کرتے ہیں، میں بھی ان کے وعظ میں شرکت کرتا ہوں، چلو آج تمہیں ان سے ملادوں، چنانچہ حسب معمول وہ تشریف لائے اور ایک اونچے منبر پر بیٹھ گئے، حدیث شریف کی کسی مطبوعہ کتاب کا ایک جزء ہاتھ میں لئے ہوئے تھے، اسی کو دیکھ کر حدیث پڑھتے تھے، پھر مختصر شرح فرماتے، اسی طرح ایک دوسری حدیث، پھر وقت مقررہ کے بعد دعا مانگ کر منبر سے نیچے تشریف لائے، سب لوگ ان سے مصافحہ کرنے کیلئے بڑھے، کچھ دیر تو ٹھہر کر اور کچھ دور چلتے چلتے وہ مصافحہ کرتے رہے، اور جب اپنے حجرے کے قریب پہونچے جو حرم شریف کے اندر ہی تھا، تو بھائی نور ولی صاحب نے ان سے بڑھ کر مصافحہ کیا اور اس کے بعد میرا تعارف کرایا ’’(یہ) سراج الحق الہندی الالہ آبادی جو آپ سے متعدد بار مل چکے ہیں، ان کے صاحبزادے ہیں‘‘ یہ سن کر انھوں نے مجھ کو لپٹا لیا، اور کہا: أي واه أنت ابن سراج الحق! وهو حبيبي وأنت حبيبه، حبيب عندنا حبيب

حبیبی یعنی اخاہ! تم سراج الحق کے بیٹے ہو! وہ تو ہمارے دوست ہیں اور تم ان کے محبوب ہو، تو تم میرے محبوب کے محبوب ہو، اس لئے میرے بھی محبوب ہو۔ اس گفتگو کے بعد وہ کمرے میں چلے گئے، ہم لوگ بھی واپس چلے آئے۔

رمضان المبارک کا منظر :اب رمضان المبارک شروع ہو چکا تھا، مکہ شریف کے قیام اور حرم شریف کے افطار صیام نے ان ایام کو بڑا ہی خوشگوار بنا رکھا تھا، ہمارا قافلہ ایک جگہ بیٹھ کر افطار کرتا اور حرم شریف کی صراحیوں کا ٹھنڈا پانی سونے پر سہاگہ کا کام کر رہا تھا، اہل عرب کی بے تکلفی اور اخوت اسلامی کا عجیب منظر نظر آیا، وہاں کسی عرب کو اپنے ساتھ افطار کرنے کی دعوت دینے کی ضرورت نہیں، بلکہ یہ دیکھا گیا کہ ایک روٹی پر تقریباً آدھ کلو کھجور رکھے ہوئے آتا اور آپ کی جماعت میں بیٹھ جاتا، بہر حال اسی طرح حرم شریف کی تراویح بھی پُر لطف رہی، بیس رکعات تراویح ایک امام پڑھاتا، اس کے بعد جب وتر کی نوبت آتی تو حنفی حضرات صفوں سے نکل کر ایک دوسری جانب جمع ہو جاتے اور وہاں حنفی امام کے پیچھے تین رکعت ایک سلام سے پڑھتے۔

مدینہ طیبہ میں : ہم سب کی رائے ہوئی کہ نصف رمضان مکہ شریف میں گزرا ہے تو بقیہ نصف مدینہ شریف میں گزرتا تو اچھا ہوتا، لہٰذا مدینہ شریف جانے کی تیاری کی گئی، نیز یہ تجویز ہوا کہ سفر دن دن میں کیا جائے، چنانچہ دس بجے دن کو روانہ ہو کر دن بھر چلتے رہے، ایک جگہ عصر کی نماز پڑھی، آگے چل کر مغرب پڑھی اب اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا اور دونوں جانب کالے کالے پہاڑ کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا تھا، کہیں کہیں سامنے ایسے پہاڑ نظر آتے تھے کہ دور سے ایسا لگتا تھا کہ آگے راستہ بند ہے، لیکن دو پہاڑوں کے بیچ میں وادی اور کچھ میدان ایسا پڑتا تھا کہ انھیں کے درمیان سے سڑک گزرتی تھی، اور پہاڑ پر چڑھنا نہ پڑتا تھا، یہ سلسلہ ختم

ہوا تو کہیں کہیں کھجور کے باغات نظر آجاتے جس سے اندازہ ہوتا کہ مدینہ شریف قریب ہورہا ہے، ہم سب کی نگاہِ شوق اب گنبد خضراء کو دیکھنے کی منتظر ہوئی، کچھ دور اسی انتظار میں اِدھر اُدھر دیکھتے چلتے رہے، اچانک سامنے نور کا ایک مینار نظر آیا، معلوم ہوا کہ یہی مسجد نبوی کا مینار ہے، جیسے جیسے وہ قریب آتا گیا دل کی دھڑکن تیز ہوتی گئی، اپنی قسمت پر ناز ہوکر ایک جانب خوشی تھی تو دوسری جانب حضرت والا کا ساتھ کھوکر غم اور افسردگی طاری تھی، اب مدینہ کی آبادی شروع ہوگئی، آہستہ آہستہ مکانوں کی تعداد زیادہ ہوتی گئی، یہاں تک کہ بازار میں ہوکر موٹر گزرنے لگا، مختلف سڑکوں سے ہوتا ہوا رباط بھوپال سے متصل موٹر رکا، فٹ پاتھ پر سامان اتار دیا گیا، اور ہم لوگ سامان کے پاس کھڑے رہے اور ذرا اوسان درست ہوئے تو مسجد نبوی میں تراویح پڑھے جانے کی آواز آئی، لیکن ہم لوگ ابھی یہاں بالکل نووارد تھے، اس وقت مسجد نہیں پہونچ سکے، ذکی بھائی نے کسی ذریعہ سے معلوم کیا کہ رباط بھوپال میں اس وقت صرف عورتیں موجود ہیں، مرد سارے نماز پڑھنے گئے ہیں، انھوں نے قافلے کی سب عورتوں کو رباط میں پہونچادیا، وہیں ذرا فاصلہ پر مولوی امجد اللہ صاحب کا مکان تھا، مگر معلوم ہوا کہ وہ بھی نماز کو گئے ہوئے ہیں، لہٰذا اب سوائے اس کے کہ وہیں سامان کے پاس بیٹھ کر ہم سب نماز کے ختم ہونے کا انتظار کریں اور کوئی صورت نہ تھی۔

تھوڑی دیر میں نماز ختم ہوئی اور سامنے سے مولوی امجد اللہ صاحب آتے نظر پڑے، جو اپنی جسامت اور رفتار سے دور ہی سے پہچان لئے جاتے تھے، ان کے آنے سے ہم سب کو اطمینان ہوگیا، پریشانی ختم ہوئی، انھوں نے مزدور بلوائے اور اجرت وغیرہ طے کرکے سب سامان کے ساتھ ہم لوگوں کو اپنے گھر لے گئے،

اس کے بعد ہم سب سے فرمایا کہ چلئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں سلام پڑھ لیجئے اور یہ بھی کہا کہ آپ لوگ جس غم میں مبتلا ہیں اس کا اندازہ تو ہم کو بھی نہیں ہوسکتا، تاہم اتنا ضرور کہتے ہیں کہ جیسے ہی آپ لوگ مسجد نبوی میں قدم رکھیں گے ان شاء اللہ غم غلط ہوجائے گا، اور آپ لوگ محسوس کریں گے کہ جیسے کسی نے قلب پر برف رکھ دی ہو، چنانچہ ویسا ہی ہوا، مسجد نبوی میں قدم ڈرتے ڈرتے رکھا، سیدھے روضۂ اقدس پر مواجہ کی جانب پہونچے اور لڑکھڑاتی زبان اور بہتے آنسو سے صلوٰۃ وسلام عرض کیا، پہلے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں، پھر حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی خدمت میں حسب مراتب۔

رمضان شریف میں مسجد نبوی رات بھر کھلی رہتی ہے، اس لئے کچھ دیر ٹھہر کر واپس آگئے، مکہ شریف میں قیام تقریباً ڈھائی ہفتہ رہ چکا تھا، اب یہاں مدینہ شریف میں تقریباً نصف ذی قعدہ تک ٹھہرنے کا ارادہ ہے، اس زمانہ میں الحمد للہ ہر نماز مسجد نبوی میں ادا کرنے کی توفیق ہوئی، اور چند ہی یوم کے بعد رمضان شریف کا عشرۂ اخیرہ آنے والا تھا مولوی امجد اللہ صاحب نے فرمایا کہ میرا معمول تو یہاں اس عشرہ میں اعتکاف کرنے کا ہے، میں نے عرض کیا کہ مجھے اور یہاں کوئی کام نہیں اس لئے میرا بھی جی چاہتا ہے کہ اعتکاف ہی کرلوں، قاری محمد مبین صاحب مدظلہٗ سے کہا، انھوں نے مجھے بخوشی اجازت دیدی اور میں معتکف ہوگیا، اب مسجد میں بس افطار کرنا، سحری کھانا، نماز باجماعت کی شرکت، صلوٰۃ وسلام پڑھنا، مسجد کے مقامات مقدسہ پر نمازیں پڑھنا، تلاوت قرآن، یہی سب دن رات کے مشغلے تھے، تراویح ختم ہوجانے پر صلوٰۃ وسلام کے لئے حاضری دیتا، اور فارغ ہوکر پوری مسجد کا گشت لگاتا، جگہ جگہ کوئی حافظ نفل میں قرآن پڑھتا ہوتا، اس کے پیچھے ایک جماعت ہوتی جس کی تلاوت دل کو

بھا جاتی، دو چار رکعت اس کے پیچھے پڑھ لیتا، کسی کے صرف پیچھے بیٹھ کر قرآن سنتا، غرض بڑی بہار کی راتیں تھیں جو بات کی بات میں گزر گئیں۔ عید کے دن صبح نماز فجر سے فارغ ہونے کے بعد تقریباً سبھی لوگ اپنی جگہ پر بیٹھے رہے، مولوی امجد اللہ صاحب نے مجھ سے فرمادیا تھا کہ تم بھی اپنی جگہ پر بیٹھے رہنا ورنہ پھر جگہ نہیں ملے گی۔ غرض تلاوت وذکر میں مشغول تھا کہ دور سے صلوٰۃ وسلام پڑھنے کی آواز آئی، کچھ دیر تک وہ جماعت پڑھتی رہی، اس کے بعد قریب سے ایک جماعت کے پڑھنے کی آواز آئی، غرض جب یہ خاموش ہوجاتے تو وہ شروع کردیتے، اس طرح نوبت بہ نوبت پڑھنے سے ایک سماں سا بندھ گیا اور سب لوگ خاموشی سے ادب کے ساتھ سنتے رہے، اب آفتاب نکل کر کچھ بلند ہوگیا تو فوراً نماز شروع ہوگئی، بعد نماز امام نے نہایت بلیغ خطبہ دیا، اور مسلمانوں کیلئے دعا کی، اوراس میں کوئی شک نہیں کہ خطبہ اور دعاء اہل عرب ہی کا حصہ ہے۔

بعد ختم رمضان آس پاس کے مقامات مقدسہ پر حاضری کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ مسجد قبا کئی مرتبہ حاضری ہوئی، جنت البقیع بھی چند بار گیا، ایک بار تو موٹر پر سبھی لوگ بہت سی جگہ زیارت کے لئے گئے، مدینہ شریف میں جناب والدی مولوی سراج الحق صاحب، مولوی عبدالحلیم صاحب جونپوری نیز بھائی ثناء اللہ صاحب فتحپوری بھی ہوائی جہاز سے چل کر آملے۔

دوسری زیارت گاہ جبل احد تھی جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جبل احد مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں اس سے محبت کرتا ہوں، اسی کے دامن میں وہ میدان ہے جہاں جنگ احد ہوئی تھی اور وہاں شہداء احد بالخصوص حضرت حمزہ کے مزارات ہیں، ایک آدھ بار یہاں بھی جانا ہوا، بس اس کے علاوہ مسجد نبوی ہی میں قیام رہتا تھا، شب کو یا دن کو کھانے کے لئے گھر چلے آئے ورنہ زیادہ

وقت وہیں گزرتا، کبھی صلوٰۃ وقیام میں، کبھی صلوٰۃ وسلام میں، بہر حال دیکھتے ہی دیکھتے یہ دن گزر گئے، اور تقریباً وسط ذی قعدہ میں مکہ شریف واپسی کا ارادہ ہوا، یہاں آکر حضرت کی مستورات نے حرم شریف کے قریب ایک مکان میں قیام کیا، اور ہم لوگوں نے برادرم عبدالغفار صاحب الہ آبادی جو حضرت سے مرید تھے اور مکہ شریف ہی میں مقیم تھے، حرم شریف سے ذرا دور ایک پہاڑی پر ان کا ذاتی مکان تھا، اس میں قیام کیا، کچھ دنوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا، لیکن حج کے قریب حرم شریف ہی میں رہنے کا داعیہ پیدا ہوا، اور اب صرف وہاں رات کو سونے کے لئے جاتے بلکہ حج سے چند یوم قبل بالکل ہی مہمانِ حرم ہو گئے، وہیں کے مشاغل ادا ہوتے، شب کو بھی وہیں اوپر کی منزل میں جا کر سو جاتے۔

غارحرا کی زیارت : جب حج کو ہفتہ عشرہ باقی رہ گیا تو ہم لوگوں نے طے کیا کہ جبل نور (غار حرا) کی بھی زیارت ہو جائے تو بہتر ہے، چنانچہ ایک موٹر پر وہاں کی زیارت کے لئے روانہ ہو گئے، لوگوں نے ڈرا رکھا تھا کہ چڑھائی بہت بلند ہے، پانی وغیرہ کا انتظام کر لیجئے گا، بہر حال جبل نور پر پہونچے، ایک ہوٹل میں کھانے پینے سے فارغ ہو کر اوپر چڑھنے کے لئے آمادہ ہوئے، تھوڑی دیر تک قدم شوق تیز اٹھا، لیکن اس کے بعد پیر جیسے بھر گیا ہو، قدم اٹھائے نہیں اٹھتا تھا، لہٰذا رفتار سست کرنی پڑی اور اطمینان سے آہستہ آہستہ آگے چڑھنے لگے، قافلوں کے آنے جانے کا سلسلہ جاری تھا، ہمارے لئے واپس آنے والوں کی تسلی موجب تقویت تھی، وہ لوگ یہی کہتے رہے حاجی صاحب بس آدھا راستہ طے ہو چکا ہے، غرض تین چوتھائی راستہ طے ہوا اور پیاس کی شدت شروع ہوئی، پسینے سے تر ہو گئے، ہمت جواب دینے لگی کہ ایک آنے والے نے کہا بس تھوڑا سا اور رہ گیا ہے۔

الغرض آہستہ آہستہ چلتے ہی رہے، یہاں تک کہ تھوڑی دیر میں ہم ایسی کھلی فضا میں پہونچے جس کے اوپر پہاڑ کی چوٹی نہ تھی، تیز ہوا نے پسینہ خشک کیا، بیٹھ کر تھوڑی دیر آرام کیا، احباب ادھر ادھر منتشر ہو گئے، جگہ وسیع تھی، سارے رفقاء ستا چکے تو پھر یکجا جمع ہوئے، اور کہا کہ اب غار حرا میں چلنا چاہئے، جو اس چوٹی سے کچھ نیچے واقع ہے، غرض ایک جانب سے ہم لوگ نیچے اترے اور راستہ میں دبتے سمٹتے ایک کھلی جگہ میں پہونچے، اس سے قبل تو ایک ایسی جگہ آئی تھی کہ آدمی پیچھے ٹیک لگا کر دایاں بازو آگے نکالے اور اس کے بعد بایاں ہاتھ نکالے، یہاں پہونچ کر کسی نے کہا کہ یہ راستہ تنگ تو ہر زمانہ میں رہا ہوگا، اس سے رسول اللہ ﷺ بارہا گزرے ہوں گے، تنگی کی وجہ سے آپ کی پشت مبارک یا سینۂ اقدس کا پتھر سے رگڑ جانا اور مس کر جانا یقینی ہے، اس تصور کے ساتھ نہایت لطف لیتا رہا، اس کے بعد ایک کھلی ہوئی جگہ ملی، اس کے بعد بائیں طرف ایک سیڑھی جاتی تھی، نیچے ایک چھوٹا سا غار تھا جس میں کھڑے ہو کر چار پانچ آدمی دو صف میں نماز پڑھ سکتے تھے، اور اس کے سامنے پتلا سا شگاف کھلا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس تاریک غار میں روشنی پیدا ہو گئی تھی، اور اس درہ میں سے ٹھیک سامنے بیت اللہ شریف نظر آ رہا تھا، جی تو چاہتا تھا کہ یہاں کچھ دیر ذکر و صلوٰۃ اور دعاء میں گزارتے، لیکن پیچھے آنے والوں کی ٹولیوں کے تقاضے شروع ہو گئے کہ جلدی باہر آیئے صاحب، دوسروں کو بھی موقع دیجئے، چنانچہ جلدی ہی جگہ خالی کرنی پڑی، اور ہم لوگ پھر وہاں سے پہاڑی کے کچھ اوپر کھلی سطح پر آ گئے، تھوڑی دیر وہیں آرام کرتے رہے، پہاڑی پر سے نیچے گزرنے والی بسیں بس ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے بچوں کے کھلونے کی بسیں، جن میں چابی بھر دی جائے اور وہ دوڑنے لگیں، اسی طرح اونٹ کے ریوڑ بکریوں کے مانند معلوم ہوتے تھے۔

غرض تھوڑی دیر ٹھیر کر ہم لوگ اسی گئے ہوئے راستہ سے واپس آئے، اوپر سے نیچے کا سفر بڑی سہولت سے اور جلد طے ہوگیا۔

اب حج کا عشرہ شروع ہو چکا تھا، حرم شریف حجاج سے بھر چکا تھا، بسہولت طواف کرنا ممکن نہ تھا، دیکھتے دیکھتے یہ ہفتہ بھی گزر گیا، اور ۸/ ذی الحجہ سے حج کے اعمال شروع ہوگئے، منیٰ، مزدلفہ اور عرفات کی حاضری اور مساجد متعلقہ میں حاضری کی توفیق ہوئی، وہاں سے واپسی پر قیام مزدلفہ اور رمی جمار سے فارغ ہوکر پھر منیٰ میں مقیم ہوئے، اور یہاں سے ارکان سے فراغت کے بعد مکہ شریف واپسی ہوئی، اور حج کے جملہ احکام سے فارغ ہوکر مکہ شریف میں مقیم ہوگئے، اور واپسی وطن کے انتظامات سوچے جانے لگے، حج کے بعد والد صاحب کا اضافہ ہم لوگوں کے قافلہ میں ہوگیا، انھوں نے اپنے ہوائی جہاز کی سیٹ پانی والے جہاز سے بدلوادی، جب واپسی کے کاغذات مکمل ہوگئے تو بیت اللہ کا طواف وداع کر کے ہم لوگ پھر جدہ واپس آگئے، مسافر خانہ میں ہی قیام رہا، اور پاسپورٹ کے اندراجات کی تکمیل کے بعد مظفری جہاز سے واپس ہوگئے۔ اس موقع پر حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کی یاد پھر آئی اور نہایت افسردگی کے ساتھ ہم لوگوں نے جہاز پر قدم رکھا، حضرت کو نہ پانے کی وجہ سے بمبئی تک یہ افسردگی قائم رہی۔ بمبئی بندرگاہ سے چل کر جائے قیام کُرلا پہونچے، بمبئی کے سبھی رفقاء سے ملاقات ہوئی، لیکن وہی تاسف ہم سب کے شامل حال رہا، بلکہ ملاقات کے لئے آنے والے حضرات بھی سب مغموم ہی دیکھے گئے، لیکن تقدیر الٰہی میں چارۂ کار ہی کیا تھا، اللہ کو جو منظور تھا ہو کر رہا، **واللہ غالب علیٰ أمرہ**۔

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں کرنا رفو
سوزنِ تدبیر چاہے عمر بھر سیتی رہے

اب تو ہم سب کے لئے حضرت کی تعلیمات، ارشادات، نصائح اور وصایا ہی پر عمل کرنے کی ضرورت ہے، اسی میں ہماری سلامتی اور حضرت اقدس کی خوشی مضمر ہے۔ باقی ظاہر ہے کہ بقول حضرت رحمۃ اللہ علیہ کہ اہل اللہ جس بستی میں ہوتے ہیں وہاں کے گویا قلب ہوتے ہیں، اور جب وہاں سے چلے جاتے ہیں تو گویا انسان کا قلب ہی اس سے رخصت ہو جاتا ہے، اس کے متعلق شہیدؔی نے کہا ہے۔ ؎

دل کے جانے کا شہیدؔی حادثہ ایسا نہیں
کچھ نہ روئے آہ گر ہم عمر بھر رویا کئے

(وصیۃ العرفان، اکتوبر و نومبر ۱۹۸۹ء)

غرض جوں توں کر کے دل پر غموں کا پہاڑ لئے ہوئے اس قافلہ نے حج کر لیا، اس شکستگی کے عالم میں جس حضور قلب اور صدق لجأ کے ساتھ حج ادا کیا ہوگا، اس کی کیفیات کا اب کون اندازہ کر سکتا ہے؟ جس قافلہ کا یہ حال ہو کہ چلا تھا تو خوشیوں اور مسرتوں سے لبریز تھا کہ میر قافلہ کی وجہ سے لوگوں میں بھی عزت و وجاہت اور محبوبیت و مقبولیت حاصل ہوگی اور بہت کچھ امید تھی کہ حق تعالیٰ کی تجلی گاہ خاص میں بھی عنایت و نوازش سے سرفراز ہوں گے، اور سرور کائنات ﷺ کی حضوری کا کیف بھی دوبالا ہوگا مگر سفر شروع ہوئے ابھی چند ہی دن ہوئے تھے، امیر قافلہ نے بجائے بیت، رب البیت کی زیارت کا احرام باندھ لیا، اب یہ کارواں بغیر سالار کارواں کے غموں سے نڈھال، زخمہائے دل سے چور، بے یار و مددگار اور بے سہارا ہو گیا تھا، جیسے کوئی بچہ ہو جو شفیق و مہربان باپ کی گود میں پرورش پا رہا ہو اور اچانک باپ کے سائے سے محروم ہو گیا ہو، ایسی حالت میں بجز ایک اللہ کی ذات کے اور کس کی طرف التفات ہو سکتا تھا؟

حضرت کی وفات پر جامؔی صاحب کی زندگی کا دوسرا باب پورا ہوا، اب وہ

اپنی زندگی کے تیسرے مرحلے میں داخل ہوتے ہیں۔ پہلے مرحلے میں حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ اور حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ظل عاطفت تھا۔ دوسرے مرحلہ میں حضرت مصلح الامتؒ کی حیات مقدسہ میں جذب تھے، اور اصل زندگی وہی تھی، اس کی یاد، اس کی لذت وحلاوت، اس کا کیف وسرور اور اس وقت کی خودفراموشی وجاں سپاری کبھی بھلائی نہیں جاسکی۔

تیسرا مرحلہ شروع ہوا تو حضرت مصلح الامتؒ ان کو اپنے حسن تربیت اور شفقت ومحبت سے اتنا سنوار گئے تھے کہ اب کسی اور سایہ کے تلاش کرنے کی ضرورت نہ تھی، اب وہ خود سایہ دار درخت تھے، جس کی چھاؤں میں دوسرے لوگ آرام پائیں۔

نیز حضرت مصلح الامتؒ جس شان کے بزرگ تھے اور ان کا جو اندازِ تربیت تھا اور ان کے جو احوال وخصائص تھے، اب اس کا ثانی ملنا مشکل تھا، جامیؔ صاحب حضرت والا کی ان خصوصیات میں اس قدر جذب اور فنا ہوچکے تھے کہ اب کسی اور آستانہ کا نگاہ میں سمانا مشکل تھا، ان کا حال تو یہ تھا کہ ؎

ہمہ شہر پُر زخوباں منم وخیالِ ماہے
چہ کنم کہ چشم بدبیں نکند بکس نگاہے

سارا شہر خوبرویوں سے بھرا ہوا ہے، لیکن میں ہوں کہ ایک چاند کا تصور ہے،
میں کیا کروں کہ میری چشم بدبیں کسی پر نگاہ ہی نہیں ڈالتی۔

اہل اللہ کے کمالات کا انکار نہیں، ان کی خوبیوں اور خصائص کا اعتراف واعتبار ہے، ان کی بزرگی لاکلام ہے، ان کا تقویٰ وطہارت اور صدق وخلوص مسلّم ہے، لیکن جو نگاہ حضرت مصلح الامتؒ پر جم چکی تھی اب کسی پر جمتی نہ تھی، حضرت مصلح الامتؒ سے تعلق کے نتیجہ میں جامیؔ صاحب کی رسائی ہر آستانۂ بلند تک ہوسکتی تھی، سب انھیں جانتے تھے، ان کی خوبیوں کو پہچانتے تھے، یہ بھی دوسروں کے کمالات کے معترف تھے،

مگر وہ بات نہیں پاتے تھے جو حضرت مصلح الامتؒ میں پا چکے تھے ؎

آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

ساری دنیا گھوم چکا ہوں، معشوقوں کی محبت کو بھی دیکھ چکا ہوں،
بہت سے حسینوں کو دیکھ لیا ہے، لیکن تم کچھ اور ہی چیز ہو۔

بس جامؔی صاحب کو جہاں حضرتؒ بیٹھا گئے تھے وہیں رہے، ان کی چوکھٹ پر جمے رہے۔ حضرت مصلح الامتؒ کے جانشین کو حضرت کہ جگہ پر سمجھا، ان کے حکم وارشاد کی تعمیل کو حضرت کے حکم کی تعمیل سمجھتے رہے، اور آخر ضروریات وحالات کے تحت جب اس دَر سے اٹھنے کا وقت آیا تو دنیا ہی سے اٹھ گئے۔

◆ ◆ ◆ ◆ ◆

باب ۱۱

یادِ شیخ

حضرت کی وفات کے بعد بہت سرگشتگی رہی کہیں جی نہیں لگتا تھا، زندگی ......ایسا معلوم ہوتا تھا کہ......تمام مشاغل سے خالی ہوگئی ہے، اب کوئی کام نہیں کوئی مشغلہ نہیں، اب وہ مجلس کی حاضری نہیں، ملفوظات کی ترتیب وتحریر نہیں، مواخذہ اور دارو گیر کی فکر مندی نہیں، محبت بھرے عتاب کی لذت وحلاوت نہیں، بار بار جامی صاحب کی پکار نہیں، جامی صاحب کتاب لائیے، مضمون نکالئے کی صدائے دلنواز نہیں، غرض جتنے مشاغل تھے یک لخت موقوف ہوگئے، ان کی زندگی تو حضرت کی زندگی سے عبارت تھی، حضرت کی زندگی ختم ہوئی تو یہ زندگی بھی سنسان ہوگئی۔ لوگ آتے تھے تعزیت کے لئے آتے تھے، تسلی کے لئے آتے تھے، اس لئے آتے تھے کہ وہ تسلی دیں اور اس لئے بھی آتے تھے کہ تسلی حاصل کریں، کیونکہ یہ غم عام تھا لیکن ویرانی دل کا وہ عالم تھا کہ ایک سناٹا سا سناٹا تھا، ایک وحشت سی وحشت تھی۔

کان لم یکن بین الحجون والصفا
انیس ولم یسمر بمکة سامر

(گویا کہ حجون سے صفا کی پہاڑی تک نہ کوئی مونس وغمگسار ہے اور نہ مکہ کی شب تنہائی میں کوئی گفتگو کرنے والا ہے)

دل کی بے تابی کبھی کبھی ادھر ادھر لئے پھری کہ شاید کہیں درد کا درماں ہو لیکن جب لوٹے تو بیتابی کچھ بڑھی ہوئی ملی۔ تاہم الہ آباد میں درد دل کا ایک مداوا تھا، شب فرقت کے لئے ایک انیس وجلیس تھا، وہ یہ کہ حضرت کی وہ جگہ تھی جہاں حضرت نے انھیں بٹھایا تھا۔ حضرت کے ملفوظات وارشادات کا ایک بڑا ذخیرہ تھا جسے برسہا برس تک وہ ''معرفت حق'' میں شائع کر سکتے تھے، پھر حضرت کے مبارک آستانہ پر بیٹھ کر حضرت کی یادوں کا چراغ جلائے رکھنا تھا، ان یادوں کو حروف ونقوش کے پیکر میں ڈھالتے رہنا تھا۔ غرض اب زندگی کا جو وقفہ باقی رہ گیا ہے اس کو اسی کام اور اسی مشغلہ میں وقف کردینا تھا۔

مولانا گل حسن قادری نے ''تذکرہ غوثیہ'' کے دیباچے میں وہ بات تحریر فرمائی ہے جو ہو بہو جامی صاحب پر صادق آتی ہے، اپنے شیخ شاہ غوث علی قلندر پانی پتیؒ کی وفات پر اپنے احوال میں لکھتے ہیں کہ:

> ''جب اس شہباز کنگرۂ تقدیس اور آفتاب جہان تنزیہ نے حجاب ونقاب ظہور چہرۂ ذات بے نشاں سے اٹھالیا۔
>
> آں قدح بشکست وآں ساقی نماند
>
> تو دل بے تاب گھبرایا، وصل و بے غمی، نشاط وہمدمی کا کارخانہ یاد آیا، جوش وحشت حد سے زیادہ ہوا، کوئی سبیل، کوئی شغل، کوئی کام اس کے علاوہ ذہن میں نہیں آیا کہ جس کے قرب وصال ولقاء جمال میں اتنی عمر گزاری بقیہ عمر بھی اسی کی یادگاری بس ہے۔
>
> اگر چہ اس ہنگامۂ قیامت کے بعد فراموشی کا غلبہ اور نسیان کا طغیان تھا، لیکن جب طبیعت ادھر مصروف ہوئی تو عالم غیب سے وہ شاہدان سخن جو از یاد رفتہ ہو گئے تھے جلوہ گر ہونے لگے، ذرا سی بات یاد آئی اور تمام قصہ سے

ہنگامۂ گزشتہ کا سماں باندھ دیا، وہی مرشد وہی ارشاد، وہی کلیم وہی کلام، وہی بیان وہی زبان، وہی چشم و گوش وہی صدائے نوشانوش، بزم خیال میں موجود ہو گئے۔

(ص ۷/۸)

اقتباس ذرا طویل ہو گیا لیکن جو بات یہاں ہے وہی جامیؔ باصفا کے حق میں بھی ہے۔ الہ آباد میں حضرت نے اپنی زندگی ہی میں اپنا قائم مقام حضرت مولانا قاری شاہ محمد مبین صاحب مدظلہ کو نامزد فرما دیا تھا، حج سے واپسی کے بعد گو صدمے کا سب سے زیادہ اثر انھیں پر تھا مگر وہ سنبھلے رہے، دوسروں کو سنبھالتے رہے، جامی صاحب کو حضرتؒ نے اپنے مکان میں جگہ عطا فرما رکھی تھی اور وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ اسی میں مقیم تھے۔ حضرت قاری صاحب نے ان کی وہ جگہ برقرار رکھی اور ''معرفت حق'' کا سارا کاروبار ان کے سپرد کئے رکھا، اب دل مہجور کے لئے بس یہی سرمایۂ تسکین تھا کہ حضرت کے اقوال و فرمودات کی ترتیب و تہذیب اور اس کی طباعت و اشاعت میں لگے رہیں، چنانچہ وہ ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے ''حدیث یار'' میں منہمک رہے۔

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الاحدیث یار کہ تکرار می کنیم

ہم نے جو کچھ پڑھا ہے سب بھلا دیا ہے سوائے محبوب کی باتوں کے کہ انھیں کو دہرائے جا رہے ہیں۔

اس دوران خانقاہ و اہل خانقاہ عجیب عجیب ابتلاء و پریشانی میں مبتلا رہے۔ طوفان بلاخیز کی تند و تیز موجیں خانقاہ سے ٹکراتی رہیں اور بھاری بھاری ستونوں کو ہلاتی رہیں، کتنے ستون ہل گئے کتنے دوسری جگہ نصب ہو گئے، کبھی خانقاہ متاثر ہوئی کبھی مدرسہ زد میں آیا، کتنے اہل تعلق ٹوٹ گئے، ایک دھاگہ کیا ٹوٹا تسبیح کے دانے بکھرتے چلے گئے، لیکن اس طوفانی ہوا میں چند لوگ پاؤں جما کر جو کھڑے ہوئے تو کوئی موج کوئی گرداب اور کوئی گردش انھیں ہلا نہیں سکی۔ ترغیبات و تحریصات آتیں اور ان کے آہنی عزائم سے

ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتیں، ابتداء میں جو عہد وفاداری باندھا تھا اسے آخر تک نباہ دیا ان میں جو نام سرفہرست تھا وہ……مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ……کا تھا۔

حضرت قاری صاحب نے بھی ان کی دلداری ودلجوئی میں کمی نہ کی، قاری صاحب کے اسی سایۂ محبت میں جامی صاحب آرام سے حضرتؒ کے علوم معارف کی تدوین واشاعت میں لگے رہے، اوراس میں شبہ نہیں کہ جس حد تک ممکن تھا انھوں نے حضرت کے تحریر شدہ تمام اقوال وارشادات کو وقف عام کردیا۔

میں جب الہ آباد پہونچا تو حضرت کے وصال کو دس سال گزر چکے تھے اور خانقاہ کے متعدد علماء اپنی بستی الگ بسا چکے تھے، مدرسہ اور خانقاہ میں جامی صاحب کے علاوہ حضرت قاری صاحب کے دو بھائی مولانا ارشاد احمد صاحب اور مولانا انوار احمد صاحب، اور حضرت قاری صاحب کے داماد مولانا عرفان احمد صاحب اور حضرت اقدس کے تیسرے داماد مولانا نورالہدیٰ صاحب تھے۔ مولانا جامی صاحب سے میرے تعلقات ''معرفت حق'' کے واسطے سے پہلے ہی استوار ہو چکے تھے، پھر میں الہ آباد آکر ان سے مل بھی چکا تھا، وہ ایک بار غازیپور مدرسہ دینیہ تشریف لے جا چکے تھے، الہ آباد آیا تو حضرت قاری صاحب کے بعد سب سے زیادہ قرب واختصاص حضرت مولانا جامی صاحب ہی سے رہا۔ میں چار سال تک جامی صاحب کے ساتھ رہا، درس ومطالعہ کے بعد فراغت کے اوقات جامی صاحب کے ساتھ گزرتے۔ اس وقت جامی صاحب سراپا تذکرۂ شیخ تھے، جب بیٹھتے کسی نہ کسی عنوان سے شیخ کا تذکرہ چھڑ جاتا اور پھر بات سے بات نکلتی چلی جاتی، وہ جب بیان کرتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ ان کا وجود مجسم حلاوت بن گیا ہے۔ حضرتؒ کا، حضرت کی مجالس کا، حضرت کے ارشادات کا نقشہ اس طرح کھینچتے کہ مجھے اس مبارک ذات کے سامنے پہونچا دیتے تھے، کبھی کبھی وہ گھنٹوں باتیں کرتے رہتے اور میں گھنٹوں سنا کرتا، اس وقت خانقاہ میں ایک بزرگ اور مقیم تھے

حضرت قاری صاحب انھیں انیس بھائی کہتے تھے، ان کے اثر سے میں بھی انیس بھائی کہنے لگا۔

انیس بھائی کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے قدرے تفصیل سے انھیں ضمیمہ ۳ میں پڑھئے، انیس بھائی حضرت کے عاشق تھے وہ اس بزم کے دوسرے رکن تھے۔ کچھ دنوں کے بعد یادِ شیخ کی اس بزم میں ایک تیسرے صاحب شریک ہوئے جناب داروغہ مشتاق احمد صاحب! ان کا بھی ذکر پہلے آچکا ہے۔ مزید ضمیمہ ۴ میں پڑھئے۔ اس وقت ان کی ڈیوٹی کوتوالی میں تھی، فرصت کے اوقات میں یہ اس مجلس کے تیسرے رکن تھے، مجھے حق نہیں کہ اپنے کو اس بزمِ خیر کا رُکن شمار کروں، کیونکہ میں صرف سامع تھا ورنہ کسی درجہ میں میرا بھی شمار ہوسکتا ہوتو یہ مجلس ’’بزمِ چہار درویش‘‘ کہی جاسکتی ہے، یہ تینوں حضرات شیخ کے صحبت یافتہ بلکہ تربیت یافتہ تھے، تینوں حضرات فراق کی چوٹ کھائے ہوئے، رنج وغم سے تینوں نڈھال، دردِ دل سے تینوں مالا مال، میں بیٹھا ان تینوں کا منھ تکا کرتا تینوں کی باتیں سنا کرتا، یہ ’’قاش فروشان دل صد پارۂ خویش‘‘ اپنے دردِ دل کا اظہار کرتے اور میں اس سے اپنے دل میں محبت اور ایمان کی حرارت بھرا کرتا، مجھے حسرت ہوتی کہ میں نے حضرت کی زیارت نہیں کی، قاری صاحب کی مجالس کے بعد مجھے کچھ تسکین وتسلی ہوتی تو انھیں ’’اقطاب ثلٰثہ‘‘ کی مجلس میں ہوتی۔ بعد میں اس ناکارہ کے قلم سے جو حضرت مصلح الامتؒ کی سوانح حیات بنام ’’حیات مصلح الامتؒ‘‘ نکلی، اس کے سلسلہ میں جوہری توانائی انھیں مجالس سے حاصل ہوئی۔ اس زمانہ میں جامی صاحب ’’حالات مصلح الامت‘‘ غیر متناہی حد تک دراز لکھے جارہے تھے، لوگ ٹوکتے کہ یہ طویل سلسلہ کب تک چلتا رہے گا، ذرا ذرا سی مناسبت سے جامی صاحب بات میں بات پیدا کر کے لکھتے چلے جاتے، اس کی قسطیں پہلے ’’معرفت حق‘‘ میں پھر ’’وصیۃ العرفان‘‘ میں چھپ رہی تھیں، لوگ انھیں ٹوکتے، وہ مسکرا کر فرماتے مجھے

لکھنے کا سلیقہ تو ہے نہیں، بس جو معلومات ہیں انھیں اکٹھا کر دینا چاہتا ہوں، لیکن دل کی بات یہ تھی کہ وہ اس سلسلہ کو ختم نہیں کرنا چاہتے تھے کہ اگر تذکرۂ شیخ کا یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا تو پھر باقی زندگی کا مصرف کیا ہوگا؟ سو جب تک ہاتھوں میں جنبش رہی اور آنکھوں میں دم رہا، جامی صاحب کا قلم چلتا رہا اور جوں ہی یہ تذکرہ تمام ہوا جامی صاحب کی زندگی تمام ہوگئی۔ ورنہ یہ داستان مختصر لفظوں میں بھی سمیٹی جا سکتی تھی

بحرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوق حضوری طول دادم داستانے را

(ایک حرف میں دنیا جہان کی تمنا بیان کی جا سکتی ہے مگر میں نے ذوق حضوری کے باعث داستان کو طویل تر کر دیا۔)

مولانا لکھتے رہے، قسط پر قسط لکھتے رہے اور داستان تھی کہ ختم ہی نہیں ہو پاتی تھی، کیونکہ یہ داستان محبت تھی حکایت عشق و مستی تھی اور اس کا کہیں کنارہ نہیں ہوتا ؎

قلم بشکن، سیاہی ریز، کاغذ دَر، ودَم درکش
حسن ایں قصۂ عشقت در دفتر نمی گنجد

قلم توڑ دو، سیاہی بہادو، کاغذ پھاڑ دو اور خاموشی اختیار کر لو، حسن! یہ قصۂ عشق ہے یہ دفتر میں نہیں سما سکتا۔

پھر تو واقعی قلم توڑ دیا گیا، سیاہی بہادی گئی، کاغذ پھاڑ دیا گیا اور داستان گو چپ ہو رہا۔ دفتر عشق لکھتے لکھتے وہ خود ایک داستان بن کر دوسری دنیا میں اپنے محبوب سے ہم آغوش ہو گیا۔

◆ ◆ ◆ ◆ ◆

باب ۱۲

چند قابل ذکر باتیں

جامی صاحب ایک صاحب دل انسان تھے، ہم طالب علمی کے دور سے انھیں دیکھتے آرہے ہیں کہ بزرگوں اوراللہ والوں سے انھیں خصوصی ربط ہے، وہ اسی کی دعا چاہتے ہیں کہ حق تعالیٰ انھیں اکابر اہل حق کے دامن سے وابستہ رکھیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ تمنا اور بزرگوں کی یہ دعا قبول فرمائی جیسا کہ گزر چکا ہے، کہ ابتداء میں وہ حضرت تھانویؒ اور حضرت الہ آبادیؒ کے دامن عاطفت سے وابستہ رہے، ان کے بعد حضرت شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوریؒ کے سایۂ رحمت میں جاپہونچے، اور پھر اسی آستانے پر رہ پڑے، ان بزرگوں اور مشائخ کی صحبت وتربیت سے کیا کیا مقامات طے ہوئے اللہ ہی جانتا ہے، لیکن یہ بات بے تکلف کہی جاسکتی ہے کہ ان کی زندگی کا مرکز ومحور دین اور صرف دین تھا، وہ مجسم دین تھے، اور یہ انسان کی بڑی خوش نصیبی ہے کہ وہ دین کے لئے اپنا سب کچھ قربان کردے۔ معصوم تو بجز انبیاء کے کوئی نہیں، خطا ہر ایک سے ہوسکتی ہے اور ہوتی ہے، ہوسکتا ہے کہ آدمی کبائر میں مبتلا ہوجائے، لیکن یہ کچھ نہیں ہے اگر وہ ''آستان یار'' پر پاؤں توڑ کر اور سب سے رخ موڑ کر بیٹھ جائے، اس کی یہ نیکی اتنی بڑی نیکی ہے کہ تمام برائیاں اس میں ہضم ہوکر رہ جائیں۔ میں جامی صاحب کے ساتھ برسوں رہا ہوں، میں نے انھیں کبھی فکر دنیا میں مبتلا نہ پایا، نہ اس کی گفتگو کرتے سنا، جو بات تھی اللہ کی اور رسول کی اور وہ بھی اپنے شیخ کے رنگ میں ڈوب کر،

ایسا نہیں تھا کہ وہ دنیا سے بے تعلق رہے ہوں۔ صاحب اولاد تھے اور اولاد بھی کثیر، سات بیٹیاں اور ایک بیٹا، اور پھر عزیزوں اور رشتہ داروں آمد مزید، مگر اس تارک دنیا کا حال یہ تھا کہ اپنا گھر تک نہیں بنایا۔ معمولی سے معمولی انسان اور کچھ کرے نہ کرے اپنے گھر کی فکر ضرور کرتا ہے، ایک چھوٹی سی جھونپڑی ہی سہی، ایک کھپریل مکان ہی سہی، لیکن وہ ایک خوشی محسوس کرتا ہے کہ میرا اپنا مکان ہے، وہ خود اور اس کے اہل وعیال سب چاہتے ہیں کہ سر چھپانے کیلئے اپنی جھونپڑی ہو، مگر جامی صاحب؟ انھیں حضرتؒ نے اپنے ساتھ رکھا اپنے مکان میں رکھا، اپنے مکان کا ایک مختصر سا حصہ بہت مختصر، ان کے استعمال کے لئے دے دیا تھا اسی میں زندگی گزار دی۔ سب بیٹیوں کا نکاح وہیں سے کیا، سب رشتہ دار وہیں آتے رہے، مہمانوں کی آمد و رفت بھی وہیں ہوتی رہی، اور سب کی خاطر و مدارات اسی چھوٹے سے مکان میں ہوتی رہی اور معیاری ہوتی رہی، وہ ہمیشہ اسی پر قانع و شاکر رہے کبھی کوئی حرف شکایت زبان سے نہ نکلا۔ ایسا نہ تھا کہ ان کے لئے حصولِ زر کے ذرائع مسدود رہے ہوں یا ان میں صلاحیت نہ رہی ہو، نہیں بلکہ وہ ایک عہد وفاداری تھا جو استوار کیا گیا تھا جو جان سے زیادہ عزیز تھا، سب زحمت گوارا، سب کلفت برداشت مگر اسے توڑا نہیں جاسکتا تھا اور نہیں توڑا گیا۔

البتہ جب ان کی زندگی کے آخری ایام تھے، اب انھیں احساس ہو چلا تھا کہ زندگی بس چند سانس ہے، بیٹیاں اپنے ٹھکانے لگ چکی تھیں، ایک بیٹا ہے اسے بھی کہیں ٹھکانے لگا دینا چاہئے، اور ادھر قاری صاحب کی اولاد اور اولاد کی اولاد پھر مکان کے بٹوارے اور تقسیم کا قضیہ پیش آچکا تھا، انھیں اپنے لئے ضرورت محسوس ہو رہی تھی، اس لئے جامی صاحب نے اپنی شدید علالت کے زمانے میں وہ زمین جو حضرت نے اپنی حیات میں جامی صاحب کے لئے وصی آباد میں لی تھی اسے آباد کرنا چاہا، نہایت عجلت میں دو ایک کمرے بنوائے اور ہنوز وہ تشنہ تکمیل تھے، کہ وہ چل دیئے، لیکن اپنے بیٹے کیلئے اور اس کی ماں کے لئے سر چھپانے کی جگہ بنا گئے اور اس طرح عہد وفاداری

بھی نباہ دیا اور اپنی نسل کے لئے انتظام بھی کر دیا۔

تواضع وخاکساری:

بزرگوں کی صحبت وتربیت میں سالکین جن کمالات سے بہرہ ور ہوتے ہیں ان میں تواضع کا خاص مقام ہے۔ تواضع کبر کی ضد ہے، آدمی اپنے کو حقیر سمجھے اس کے دل میں اپنی کم مائیگی اور حقارت رچ بس جائے اور اس میں کوئی تکلف نہ ہو یہ اعلیٰ مقامات تصوف میں سے ہے۔ جامی صاحب میں یہ وصف بدرجۂ کمال تھا، وہ بہت سے کمالات وخصوصیات کے حامل تھے، صاحب نظر عالم تھے، تحریر کا ایک خاص ذوق واسلوب رکھتے تھے، تصوف اور سلوک تو ریشہ ریشہ میں بسا ہوا تھا، بزرگوں کے صحبت یافتہ تھے مگر کہیں کسی موقع پر اپنی برتری کا خیال، خودی کی نمود اور اپنی شخصیت کا رکھ رکھاؤ محسوس نہیں ہوتا تھا، وہ ہم جیسے طالب علموں سے مستفیدانہ ہی ملنے کی کوشش کرتے، کچھ لکھتے تو برائے مشورہ دکھاتے، اصلاح کے لئے اصرار کرتے اگر کوئی مشورہ دیا جاتا تو بہت انشراح کے ساتھ سنتے اور سمجھ میں آجاتا تو فوراً قبول کرتے، نہیں تو اپنی بات سمجھاتے۔

حضرتؒ کی وفات کے بعد سفر میں کہیں جاتے تو لوگ حضرت کی یادگار سمجھ کر خصوصی استقبال کرتے اور مجلس میں کچھ بیان کرنے کی درخواست کرتے، میں نے بارہا دیکھا کہ لوگ درخواست کر رہے ہیں اور یہ پریشان ہو رہے کہ میں کیا بیان کروں؟ لوگ زیادہ اصرار کرتے تو فرماتے کہ میں تو ناظرہ خواں ہوں کہیئے تو کچھ پڑھ کر سنا دوں، لوگوں کا عام ذوق وعظ وتقریر سننے کا ہے لکھی ہوئی چیز کے متعلق خیال ہوتا ہے کہ اسے تو ہم خود ہی پڑھ سکتے ہیں پھر دوسرے کے منہ سے کیا سنیں، پھر یہ بھی کہ کسی عالم سے کہا جائے کہ فلاں کتاب پڑھ کر سنا دیجئے تو وہ بھی اپنے دل میں سبکی محسوس کرتا ہے کہ لوگ سمجھیں گے انھیں کچھ آتا نہیں جبھی تو کتاب دیکھ کر پڑھتے ہیں، لیکن جامی صاحب ان وساوس وخطرات سے بے نیاز بے تکلف فرماتے کہ میں تو ناظرہ خواں ہوں، مجھے

کچھ آیا نہ گیا، حضرت کی مجالس چھپی ہوئی ہیں کہئے تو انھیں کو پڑھ کر سنا دوں۔ بات یہ ہے کہ جس کی باتیں دل میں بسی ہوئی تھیں اس سے توجہ کا ہٹانا بھی گوارا نہ تھا، لوگ اسی کو چاہتے تو حلقہ جمع ہو جاتا نہ کرسی نہ فرش، بس سب کے درمیان بیٹھ جاتے اور معرفت حق کی ناظرہ خوانی شروع کر دیتے کہیں کہیں کچھ تشریحی کلمات بھی کہتے جاتے، انھیں اس کا خیال بالکل نہ ہوتا کہ لوگ کیا سمجھیں گے، انھیں تو بس حضرت مولانا کا کلام سنانے میں لطف آتا تھا۔

الہ آباد خانقاہ میں حضرت قاری صاحب جب سفر میں تشریف لیجاتے تو پابندی سے ان کی جگہ مجلس کرتے، اس میں بھی مواعظ وملفوظات ہی کا مذاکرہ ہوتا، زبانی تقریر نہ کرتے اور جب حضرت قاری صاحب تشریف فرما ہوتے تو مجلس میں نہایت ادب سے حضرت کے ملفوظات ان کی زبان سے سنا کرتے۔ بیماری کی تکلیف ہوتی، درس کی مشغولیت ہوتی تو تشریف نہ لاتے ورنہ بغیر عذر ناغہ نہ کرتے۔

یہ اسی تواضع کے اثمار و آثار ہیں جس کا ذکر ہو رہا ہے، حضرت قاری صاحب کا حضرت کی نسبت کی وجہ سے نہایت ادب کرتے تھے اور متواضعانہ ان کی خدمت میں حاضری دیتے تھے، حضرت کے پرانے متوسلین میں سے کوئی آ جاتا تو اس کے سامنے بچھے جاتے اور پھر حضرت کے تذکروں کا سلسلہ چل پڑتا۔

کبھی کبھی حضرت کی مسجد میں جمعہ کے روز یا عیدین کے موقع پر منبر پر بیٹھ کر وقتی مسائل وفضائل بیان کرتے، اس میں بھی وہی ناظرہ خوانی حسب دستور تھی، کوشش کرتے کہ حضرتؒ کے مطبوعہ مواعظ میں ضرورت کا مضمون مل جائے اور اکثر مل ہی جاتا، اسے پڑھ دیتے، نہ ملتا تو حدیث کی کتابوں سے کچھ نوٹ تیار کر لیتے اور انھیں ہاتھ میں لے کر پڑھتے اور تشریح کرتے۔

صبر وشکر:

جامی صاحب کو جب سے میں نے دیکھا کسی نہ کسی عارضہ میں مبتلا پایا، پاؤں میں مستقل تکلیف تھی، گھٹنوں میں، ٹخنوں میں شدید درد ہوتا تھا، بسا اوقات چلنے پھرنے سے معذور ہو جاتے، دواؤں کا سلسلہ چلتا رہتا کبھی ہومیو پیتھ کبھی ایلو پیتھ کبھی یونانی مگر درد ختم نہ ہوتا۔ انگریزی دواؤں سے افاقہ ہو جاتا تو چلنے پھرنے لگتے پھر شدت ہوتی تو چارپائی پکڑ لیتے، کوئی مہینہ شاید ایسا نہیں گزرتا تھا جس میں کچھ وقت کے لئے معذور نہ ہو جاتے ہوں، مگر صرف اتنا ہی ہوتا کہ باہر آمد ورفت بند ہو جاتی ورنہ ان کے کرنے کے سب کام جاری رہتے طلبہ کو گھر پر ہی بلا لیتے اور سبق پڑھاتے ’’معرفت حق‘‘ اور ’’وصیۃ العرفان‘‘ کے لئے مضامین کی تیاری ان کی ترتیب وتہذیب کرتے، ہم لوگ بھی وہیں پہونچ جاتے، بیماری کا تذکرہ بقدر خبر کرتے اور پھر ایسے ہو جاتے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، حالانکہ درد کا وہ عالم ہوتا تھا کہ پاؤں ہلا نہ سکتے تھے، بعد میں پھوڑا بھی ہو گیا تھا، گھٹنا بالکل جام ہو گیا تھا، درد ناقابل برداشت ہوتا، لیکن مسکراتے رہتے کوئی حال پوچھتا تو مسکرا کر جواب دیتے، انھوں نے کسی عیادت کرنے والے کو کبھی احساس تکلیف میں مبتلا ہونے نہیں دیا۔

۱۹۸۹ء میں اللہ تعالیٰ نے مجھے سفر حج کی سعادت بخشی، بمبئی سے جہاز تھا، میں نے الہ آباد سے ریل کا ٹکٹ لیا تاکہ یہاں کے بزرگوں بالخصوص حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب قدس سرہٗ سے ملاقات کر کے اور ان سے دعائیں لے کر جاؤں، الہ آباد حاضری ہوئی تو جامی صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوا، اس وقت وہ مستقلاً صاحب فراش ہو چکے تھے، تکلیف ایسی تھی کہ دیکھی نہیں جاتی تھی، میں نے اطلاع کرائی خانقاہ کے اسی چھوٹے سے مکان میں مقیم تھے، پردہ کرایا، میں حاضر ہوا تو دیکھ کر تڑپ گیا ایک وقت وہ تھا کہ بھاری بھرکم جسم تھا سارا بدن شاداب تھا، اور ایک وقت یہ ہے کہ بس

ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کے رہ گئے ہیں، دیکھتے ہی میرے چہرے پر رنج وغم کی گہری سنجیدگی چھا گئی۔ جامی صاحب نے اسے بھانپ لیا فوراً مسکرائے اور فرمایا ؎

صورت ببیں حالت مپرس

اسی طرح ہلکے ہلکے انداز میں فرماتے رہے کہ لوگ آپ سے دعاء کی فرمائشیں کرتے ہوں گے، میری تو پوری صورت ہی دعاء کی فرمائش ہے، آپ دیکھ لیجئے بس یہی کافی ہے، پھر کچھ دیر تک باتیں ہوتی رہیں، وہ لیٹے رہے اس لئے کہ بیٹھنے کی تاب نہیں تھی، اپنے احوال بتاتے رہے، میرے اور میرے بچوں کے احوال پوچھتے رہے، میں سینکڑوں من کا بوجھ لے کر وہاں سے رخصت ہوا، مگر ان کی سبک روحی میں ذرا بھی فرق نہیں پایا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

* * * * *

باب ۱۴

لطائف جامی

جامی صاحب روکھے سوکھے نرے سنجیدہ آدمی نہ تھے، کہ چہرے پر یبوست طاری ہو، بلکہ نہایت خوش مزاج اور ظریف الطبع تھے، ظرافت اور وہ بھی لطیف ظرافت ذہانت کا خاصہ ہے، جامی صاحب بے حد ذہین تھے اور رعایت لفظی کے تو گویا امام تھے، ذرا ذرا سی بات پر لطیفہ پیدا کرتے، ان کی مجلس میں کوئی غمزدہ اور اُداس نہیں رہ سکتا تھا، ان کی کوئی مجلس ہلکی پھلکی دل خوش کن ظرافت اور رعایت لفظی کے خوبصورت چٹکلوں سے خالی نہ ہوتی۔

حضرت مولانا کی خدمت میں وہ خاموش اور محتاط رہتے، ذہانت وہاں بھی ظرافت کے شگوفے کھلانا چاہتی مگر حضرت کے احترام میں اس پر پابندی لگائے رہتے، تاہم کبھی کبھی وہاں بھی کوئی شگوفہ کھل ہی جاتا، اگر ان کے لطائف لکھے جائیں تو مستقل ایک دفتر تیار ہو جائے، لیکن چند ایک کا ذکر کر دینا مناسب ہے، کیونکہ جامی صاحب کی حیات کا یہ وہ عنصر ہے جو بہت نمایاں تھا، اگر یہ باب نہ لکھا جائے تو ان کے جاننے والے اس سوانح سے شاید انھیں پہچان نہ سکیں۔

”غیر مبین“ کے بس کی بات نہیں:

حضرت مولانا نے پنجوقتہ نمازوں کے لئے امام حضرت قاری محمد مبین صاحب

کو مقرر کر رکھا تھا، قاری صاحب بہت عمدہ قرآن پڑھتے ہیں، حافظ ہیں اس لئے تراویح پڑھانے کی ذمہ داری بھی انھیں کی تھی، قاری صاحب ایک بار تراویح پڑھانے میں زیادہ بھولے، اور بار بار لقمہ دینے کی ضرورت پیش آئی، حضرت نے انھیں پیچھے آنے کا حکم دیا اور ایک دوسرے جیّد حافظ کو ان کی جگہ متعین کر دیا، وہ خوب پختہ حافظ تھے، مصلے پر آئے لیکن حضرت مولانا کی امامت آسان نہ تھی، حضرت کا رعب اور دبدبہ ایسا تھا کہ مضبوط سے مضبوط دل کے لوگ تھرّا جاتے۔ انھوں نے پڑھنا شروع کیا، لیکن وہ بھی بھولنے لگے، پچیسویں پارے میں جب اس پر پہونچے **وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ**، تو ایسا بھولے کہ لقمہ دینے کے باوجود نہیں چل سکے، مجبوراً رکوع کرنا پڑا، نماز سے فراغت کے بعد قیام گاہ پر آ کر اس کی گفتگو چل پڑی، جامؔی صاحب نے برجستہ کہا کہ حضرت اس مصلے پر نماز پڑھانا ”غیر مبین“ کے بس کی بات نہیں ہے، حضرت ہنس پڑے اور پھر دوسرے دن سے قاری مبین صاحب حسب معمول تراویح پڑھانے لگے۔

۔۔۔اسی لئے کان پکڑتے ہیں:

لکھنؤ کے حکیم شمس الدین صاحب شفاء الملک ایک حاذق طبیب تھے اور نہایت دیندار اور اچھے عالم و فاضل، انداز گفتگو ان کا بہت دل آویز تھا، حضرت سے بیعت تھے، حضرت نے انھیں اجازت بھی عطا فرمائی تھی۔ ایک دن حضرت سے باتیں کر رہے تھے، کسی تقریب سے انھوں نے عرض کیا کہ حضرت بستر پر اگر چیونٹیاں چڑھ جائیں تو جب تک احتیاط سے ایک ایک چیونٹی باہر نہ کر لوں بستر پر جا نہیں سکتا، کیونکہ چیونٹی کان میں گھس جاتی ہے اور کان سے دماغ تک ایک منفذ (راستہ) ہے، چیونٹی اسی منفذ سے دماغ کے مغز تک پہونچ جاتی ہے اور اس سے ناقابل برداشت تکلیف ہوتی ہے۔ حکیم صاحب کا سلسلۂ بیان رکا تو جامی صاحب بول پڑے:

”اچھا حکیم صاحب! اب سمجھ میں آیا کہ بچے جب سبق بھولتے ہیں تو ان کا کان اسی لئے پکڑا جاتا ہے کہ کان سے دماغ تک منفذ ہے، اسی سے ان کا دماغ کھل جاتا ہے۔“

حکیم صاحب یہ سن کر اچھل پڑے، اور زور زور سے داد دینے لگے، واہ جامی صاحب واہ! آپ کو خوب نکتہ سوجھا، حکیم صاحب تو داد دیتے رہے اور جامی صاحب اس فکر میں پڑ گئے کہ کہیں حضرت کو ناگوار خاطر نہ ہو، لیکن حضرت بھی مسکرا رہے تھے۔

چٹ آئی پٹ بچھی:

ہمارے دوست مولانا عبدالرب صاحب جہانا گنج ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے اچھے ذی استعداد فاضل ہیں، کچھ دنوں انھوں نے وصیۃ العلوم الہ آباد میں پڑھایا ہے، ان کی درس گاہ میں چٹائی کی ضرورت تھی، حضرت قاری صاحب بمبئی سے تشریف لائے تو ان کے لئے چٹائی لیتے آئے، جونہی اسٹیشن سے سامان لایا گیا، انھیں حوالہ کردی، انھوں نے فوراً ہی درسگاہ میں بچھا لیا۔ جامی صاحب تھوڑی دیر کے بعد تشریف لائے، تو کمرے کا رنگ بدلا ہوا دیکھا، انھوں نے دریافت کیا تو بتایا گیا کہ حضرت قاری صاحب بمبئی سے لائے ہیں، مسکرا کر فرمایا:

”اچھا! چٹ آئی، پٹ بچھی۔“

چٹائی اور چٹ آئی، اور چٹ کی مناسبت سے پٹ، رعایت لفظی کا لطیف نمونہ ہے۔

کون لڑ کے گیا:

رعایت لفظی کی مناسبت سے ایک اور لطیفہ یاد آیا، خانقاہ میں جہاں مجلس ہوا کرتی ہے، اس سے متصل جانب غرب میں جو کمرہ ہے وہی میری درسگاہ تھا، جامی

صاحب نے پکارا کہ مولانا آیئے چائے پی لیجئے، میں نے کہا ابھی آتا ہوں، سبق پورا کرنے میں ذرا تاخیر ہوئی، حاضر ہوا تو فرمایا آپ نے بڑی دیر کردی، چائے ٹھنڈی ہوگئی، میں نے کہا ابھی لڑکے گئے ہیں، تو میں آیا، مسکرا فرمایا:

کون لڑکے گیا آپ سے؟

مجلس زعفرزن زار ہوگئی۔

رَأَیْتُ:

خانقاہ شریف کے خاص اہل تعلق میں جون پور کے ایک صاحب تھے جمیل بھائی، ہم سب لوگوں کا ان سے گہرا تعلق تھا، وہ بہت دیندار اور صاحب استقامت انسان تھے، اے۔ جی آفس میں ملازم تھے، ان کے لڑکے کی شادی ہوئی، اس کی تقریب میں انھوں نے ولیمہ کی دعوت کی، خانقاہ کے تمام افراد اس میں شریک ہوئے، جامی صاحب بھی تھے، الہ آباد میں دعوت میں پلاؤ کے ساتھ رایتہ کا بہت رواج ہے، رایتہ دہی میں پیاز، زیرہ، نمک، گول مرچ اور بعض دوسرے مسالے ڈال کر بناتے ہیں، لذیذ بھی ہوتا ہے اور ہاضم بھی۔ دسترخوان پر سب لوگ بیٹھ گئے، پلاؤ آگیا، رایتہ آگیا، کھانا شروع ہوا، جامی صاحب پلاؤ کھا رہے تھے، انیس بھائی الہ آبادی نے متوجہ کیا کہ جامی صاحب رایتہ، بے ساختہ فرمایا:

رَأَیْتُ (میں نے دیکھا)

لوگ مسکرا پڑے، رایتہ کا تلفظ عربی کے لفظ رایتَ کے مماثل ہے، جس کے معنی ہیں آپ نے دیکھا، اسی مناسبت سے جامی صاحب نے کہا، رَأَیْتُ یعنی جی میں نے دیکھا۔

میں نے کہا جا پانی لا:

جامی صاحب کو میٹھا بہت مرغوب تھا، چائے بہت میٹھی پیتے تھے، مجھے میٹھے

سے بالکل مناسبت نہ تھے، چائے تو ذرا میٹھی ہو جائے تو میں نہیں پی سکتا۔ الہ آباد کے ہوٹلوں میں عموماً چائے میٹھی پی جاتی ہے، مجھے چائے منگوانی ہوتی تو تاکید کرتا کہ شکر کم ڈالیں، جامی صاحب موجود ہوتے تو فرماتے کہ جتنی شکر ادھر کم کی جائے اتنی میری چائے میں بڑھا دی جائے۔

حضرتؒ کے زمانے میں ایک بار جامی صاحب اور دوسرے کچھ مخصوص حضرات ہوٹل میں چائے پینے گئے، جامی صاحب کا دستور تھا کہ چائے جب آتی تو وہ فرمائش کرتے کہ چینی لاؤ، آج جو چائے آئی تو جامی صاحب کو پانی کی بھی ضرورت تھی، انھوں نے کہا پانی لاؤ، بیرا دوڑا ہوا گیا اور معمول کے مطابق شکر لے آیا، جامی صاحب نے مسکرا کر کہا، دیکھئے میں نے اس سے کہا جاپانی لا، تو چینی لایا۔ جاپانی اور چینی کی دوہری مناسبت پر سب مسکرا اٹھے۔

کل کیوں آج صدر مدرس:

ایک مرتبہ جامی صاحب کے ساتھ الہ آباد کے مشہور قصبہ مئو آئمہ جانے کا اتفاق ہوا، وہاں ہم لوگ مدرسہ انوار العلوم میں ٹھہرے، جامی صاحب تو متعارف تھے، میں ہی مجہول تھا، ایک صاحب نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ فلاں صاحب ہیں، مدرسہ وصیۃ العلوم میں مدرس ہیں، بلکہ کہنا چاہئے **کل صدر مدرس** ہیں (یعنی صدر مدرس کی طرح ہیں) جامی صاحب بول پڑے:

”کل کیوں؟ آج ہی صدر مدرس ہیں۔“

اہل مجلس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

سبعةٌ وثامنهم كلبهم:

ایک مجلس میں مرزاپور کے ایک حکیم صاحب تشریف لائے، ایسا محسوس ہو رہا

تھا کہ جامی صاحب سے بہت پرانی شناسائی ہے، لیکن ملاقات برسہابرس کے بعد ہوئی، وہ جامی صاحب سے ان کے احوال تفصیل سے معلوم کر رہے تھے، انھوں نے اولاد کی تفصیل دریافت کی، تو جامی صاحب اچانک مسکرا پڑے۔ جامی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے سات بیٹیاں اور ایک بیٹا عنایت فرمایا ہے، بیٹے کا نام محی الدین ہے، عزیز موصوف عربی چہارم میں پڑھ رہے تھے اور اس مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، جامی صاحب نے مسکرا کر بیٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ محی الدین سے معذرت کے ساتھ:

''سبعةٌ وثامنهم كلبهم''

یہ ایک آیت کا فقرہ ہے جس میں اصحاب کہف کی تعداد بتائی گئی ہے، حاصل یہ کہ ''وہ سات ہیں آٹھواں ان کا کتا ہے'' اس طرح جامی صاحب نے ایک لطیف اشارے میں اولاد ذکور واناث کی تفصیل بیان کردی۔

جامی صاحب کی لطیف ظرافت ان کی طبیعت تھی، اس کے لئے انھیں کچھ سوچنا اور تکلف کرنا نہیں پڑتا تھا، آخر میں جب وہ بیماری کی شدت جھیل رہے تھے اس وقت بھی یہ رنگ طبیعت باقی تھا، ذہانت کے سرچشمے سے ظرافت ابلتی رہتی تھی، لیکن ان کی ظرافت کبھی فحش اور رکاکت میں داخل نہیں ہوئی۔

* * *

باب ۱۴

تالیفات

جامی صاحب نے بہت کچھ لکھا ہے، لیکن جیسا کہ معلوم ہے انھوں نے اپنی شخصیت کو حضرت مصلح الامتؒ کی شخصیت میں ضم کر دیا تھا، پس حضرت کی جتنی تالیفات ہیں وہ زیادہ تر جامی صاحب کے قلم کی کاوش ہیں، مضامین مولاناؒ کے، الفاظ مولانا کے، البتہ ضبط وتحریر اور تہذیب وترتیب جامی صاحب کی، اسی طرح حضرتؒ کی مجالس جنھیں یکجا کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہوں گی، ان کی ترتیب وتدوین بھی زیادہ تر جامی صاحب ہی کا کارنامہ ہے، تاہم ان کی نسبت تصنیف جامی صاحب کی طرف نہیں کی جاسکتی، البتہ بعض کتابوں کا ترجمہ حضرت کے ایماء پر جامی صاحب نے کیا ہے، اور بعض کا حضرت کے وصال کے بعد اہل خانقاہ کے مشورے سے کیا ہے، ان کا اجمالی تعارف پیش ہے۔

(۱) ترصیع الجواہر المکیۃ:

یہ عربی زبان میں تصوف کی ایک بلند پایہ کتاب ہے، حضرت مصلح الامت کو الہ آباد میں ایک صاحب علم کا بیش قیمت کتب خانہ قیمتاً دستیاب ہو گیا تھا، اس میں یہ کتاب تھی، حضرت نے دیکھا تو بہت پسند آئی، آپ نے جامی صاحب کو اس کے ترجمہ پر مامور فرمادیا، جامی صاحب نے حضرت کی حیات ہی میں اس کا ترجمہ مکمل کر کے حضرت کو دکھالیا تھا، وہ قسط وار ’’معرفت حق‘‘ میں شائع ہوتا رہا، پھر کتابی صورت میں

شائع ہوا۔ اس کے خاتمہ پر جامی صاحب لکھتے ہیں:

> ”الحمدللہ کہ اس شمارہ پر ”ترصیع الجواہر المکیۃ“ کے ترجمہ کا جو سلسلہ کہ شمارہ ۱، جلد: ۱ سے شروع ہوا تھا وہ ختم ہوگیا۔ راقم کتاب کے ترجمہ سے تو اوائل اکتوبر ۱۹۶۷ء ہی میں فارغ ہو چکا تھا، چنانچہ بقیہ تمام مسودات حضرت والا نوراللہ مرقدہ کے ملاحظہ سے گذار کر ۱۴ ر یا ۱۵ ر اکتوبر کو یعنی وصال سے تقریباً ۴۰ ر یوم قبل دفتر معرفت حق کو بھیج دیا تھا۔۔۔۔۔ الحمدللہ اس پر مسرت ہے کہ حضرت والا کی یہ خواہش حضرت کے سامنے ہی پایۂ تکمیل کو پہونچ گئی۔

(۲) اسوۃ الصالحین:

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ایک مفید تالیف ”آداب الصالحین“ ہے، یہ کتاب فارسی میں ہے۔ دہلی کے مشہور عالم حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب محدث دہلوی کے شاگرد رشید مولانا نواب قطب الدین خان جنھوں نے مشکوٰۃ شریف کا ترجمہ مظاہر حق کے نام سے کیا ہے، انھیں نے ”آداب الصالحین“ کا بھی اردو میں ترجمہ کیا ہے، یہ ترجمہ پرانی اردو میں ہے، جو اس وقت نامانوس اور متروک ہو چکی ہے، اس ترجمہ کا نام ”ہادی الناظرین“ ہے، حضرت مصلح الامت کو یہ کتاب بہت پسند تھی، مولانا جامی صاحب نے موجودہ سلیس اردو کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا ہے اور اس کا نام ”اسوۃ الصالحین“ رکھا، یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور کئی بار شائع ہوئی، اس کی تمہید میں جامی صاحب لکھتے ہیں:

> ”کتاب ہذا میں چونکہ معیشت اور معاشرت کے آداب نیز مصاحبت اور مخالطت کے احکام کا بیان تھا، اس لئے ہمارے حضرت مصلح الامت نوراللہ مرقدہ کو بھی یہ رسالہ بہت پسند آیا، مجلس میں تھوڑا تھوڑا کر کے تقریباً سارا ہی رسالہ سنایا اور اس کے بعض مضامین کو تو تفصیل سے مکرر سہ کرر بیان فرماتے اور جو مقامات

اہم ہوتے ان پر حاشیہ میں نشان بنا دیتے تھے، اس کے متعلق متعدد بار راقم سے فرمایا کہ حضرت شیخ دہلوی کی یہ کتاب نہایت عمدہ ہے اور مجھے بہت پسند ہے، لیکن اردو اس کی پرانی ہے اب اس زمانہ میں زبان بدل جانے کی وجہ سے اس کا سمجھنا آسان نہیں ہے، اس لئے اتنی عمدہ کتاب کے استفادے سے لوگ محروم ہیں، میں اخلاق پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں اور لوگوں کو آدابِ دین سکھانا چاہتا ہوں تو اس کے لئے یہ ذخیرہ اچھا خاصا موجود ہے، ضرورت صرف اس کی ہے کہ زبان بدل دی جائے اور کتاب کی اشاعت کی جائے، اور اس کے مضامین لوگوں کو پہونچائے جائیں، لہٰذا اگر تم ہمت کرو تو یہ ایک کام ہو جائے، اور امید ہے کہ اس سے مسلمانوں کو بہت نفع پہونچے گا، مگر مشاغل کثیرہ نے اس وقت مہلت نہ دی کہ میں اس کام کو حضرت کے سامنے ہی انجام دیتا۔

اور کتاب کا تعارف خود جامی صاحب نے اس طرح کرایا ہے:

''رسالہ ''آداب الصالحین'' مولفہ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی فارسی زبان میں ایک نہایت ہی مفید اور اصلاحی رسالہ ہے، وجہ تالیف تو خود حضرت شیخ موصوف نے اپنے مقدمہ میں بیان فرمائی ہے، لیکن اس کے افادہ کو دیکھ کر حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب محدث دہلوی کے تلمیذ خاص مولانا نواب قطب الدین خاں صاحب سے ان کے کسی مخلص نے فرمائش کی کہ حضرت شیخ کا یہ رسالہ نہایت مفید اور نافع خاص وعام ہے، لہٰذا اگر اس کا ترجمہ اردو زبان میں بھی ہو جائے تو اس کا نفع عام ہو جائے، چنانچہ نواب صاحب موصوف نے اس وقت کی مروجہ زبان میں اس کا ترجمہ کیا، جس کا تاریخی نام ''ہادی الناظرین'' رکھا، اور جابجا (فائدہ) کا عنوان قائم کرکے اس میں بعض ضروری مسائل کا اضافہ بھی فرما دیا (چنانچہ میرے سامنے اس وقت یہی کتاب ہے)

(۳) ترغیب الفقراء والملوک الٰی مافی کتاب سلک السلوک:

یہ فارسی رسالہ ''سلک السلوک'' کا ترجمہ ہے۔ یہ رسالہ شیخ ضیاء الدین نخشی کا تالیف کردہ ہے، اس میں تصوف کے جواہر پارے الگ الگ سلک کے عنوان سے تحریر کئے گئے ہیں، مسائل تصوف کو حضرت مولف نے اس خوبی کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ وہ اپنے رنگ میں بالکل منفرد ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اخبار الاخیار میں فرماتے ہیں:

> ''''سلک السلوک'' وہ کتاب ہے جو اپنی حلاوت اور رنگینی اور لطافت بیانی کے ساتھ ساتھ پُر تاثیر حکایات ونصائح اولیاء سے لبریز ہے، آپ کی اکثر کتب میں ایک طرز کے قطعات ہیں، سنا گیا ہے کہ ضیاء نخشی شیخ فرید الدینؒ کے مرید تھے، جو سلطان التارکین شیخ حمید الدین ناگوریؒ کے خلیفہ اور پوتے تھے، واللہ اعلم، آپ کی وفات ۷۵۱ھ میں ہوئی۔ (اخبار الاخیار، ترجمہ اردو، ص: ۲۲۵)
>
> (کتاب میں ناشر نے تحریر کیا ہے کہ حضرت ضیاء الدین نخشی، خواجہ فرید الدین گنج شکر علیہ الرحمہ کے خلیفہ تھے، یہ صحیح نہیں ہے، وہ دوسرے بزرگ ہیں جو حضرت خواجہ نظام الدین علیہ الرحمہ کے شیخ تھے)

جامی صاحب کو اس کتاب کا ایک پرانا نسخہ دستیاب ہو گیا تھا، انھوں نے اس کا مطالعہ کیا تو پسند آیا، حضرت قاری صاحب مدظلہ اور دوسرے احباب کے سامنے پیش کیا تو سب نے پسند کیا، چنانچہ اس کا ترجمہ سلیس اردو میں شروع کر دیا۔ اصل فارسی متن اور اس کا ترجمہ قسط وار وصیۃ العرفان میں شائع ہوتا رہا اور تکمیل کے بعد کتابی شکل میں شائع ہوا، جامی صاحب نے ترجمہ کے مقدمہ میں لکھا ہے:

> ''جس طرح ترصیع کا ایک قدیمی نسخہ حضرت اقدسؒ کو الہ آباد کی خریدی ہوئی کتابوں میں ملا تھا، اسی طرح سے حضرتؒ کے بعد ایک اور کتاب ''سلک السلوک'' مصنفہ حضرت مولانا ضیاء الدین نخشی بھی ملی، اولاً جب سرسری طور پر

اسے دیکھا تو اسی سے اندازہ ہوا کہ مضامین اس کے نہایت عمدہ ہیں، پھر غور سے دیکھا تو واقعی اسے سلک السلوک یعنی سلوک کے موتیوں کی لڑی ہی پایا۔۔۔۔۔

اس کے بعض مضامین حضرت مخدومی ومحترمی جناب قاری محمد مبین صاحب خلیفہ وجانشین حضرت مصلح الامت کو سنائے، حضرت قاری صاحب مدظلہ نے بھی بہت پسند فرمایا، اور فرمایا کہ یہ تو اس لائق ہے کہ ''معرفت حق'' میں اس کا ترجمہ شائع کیا جائے، اس قسم کے مضامین کی اشاعت حضرت والا کی عین مرضی تھی۔

لیکن مجھے خیال ہوا کہ کسی کتاب کا افادۂ تام اس وقت ہوتا ہے جب وہ حامل المتن بھی ہو، تاکہ ایک جانب اگر اہل علم اس کے اصل متن سے مستفید ہوں تو دوسری جانب عوام اس کے ترجمہ سے لطف اندوز ہوں، لہٰذا ایک کالم میں متن بھی ہوگا اور دوسرے کالم میں اس کا ترجمہ درج ہوگا۔

اللہ تعالیٰ اس ترجمہ سے بھی عام مسلمانوں کو نفع بخشے جیسا کہ اس کے متن اور اصل سے خلق اللہ کو نفع پہونچا ہے، اور سب سے پہلے اس ہیچمدان مترجم (جامی) کو ان جواہر پاروں پر عمل کرنے کی توفیق بخشے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ترجمہ کا نام بھی تجویز کردیا جائے، چنانچہ اپنے اس ترجمہ کا نام ''ترغیب الفقراء والملوک'' رکھتا ہوں، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

(۴) بیاض خاص:

حضرت اقدس نے خاص خاص مضامین کے لئے ایک بیاض بنائی تھی، جس میں حضرت والا اپنے ذوق وحال کے مطابق پسندیدہ علوم ومعارف کو نقل کرلیتے یا کرالیتے، اس میں عربی، فارسی اور اُردو تینوں زبان کے مضامین ہوتے، مولانا جامی صاحب نے اس کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ معرفت حق میں شائع کیا، یہ دوجلدوں میں مکمل ہوئی ہے، علیحدہ کتابی شکل میں ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے، بے حد مفید اور

کار آمد ہے، اس کی تمہید میں جامی صاحب لکھتے ہیں:

> ”اس بیاض کی خصوصیت کے متعلق زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، اس لئے کہ اس کے شرف وفضل کے لئے یہی کافی ہے کہ یہ حضرت محی السنۃ مصلح الامت کی طرف منسوب ہے، ظاہر ہے کہ جب اس میں ایک مرشد عالم کے منتخب مضامین درج ہیں، تو پھر اس کے نافع اور مفید ہونے میں کیا کلام ہوسکتا ہے، نیز اس کے مضامین کے انتخاب سے حضرت کے ذوق عام وحال کا بخوبی سراغ لگ سکتا ہے، جو ان کے متعلقین کے لئے عموماً اور ان کے مسترشدین اور تلامذہ کیلئے خصوصاً بیش بہا دولت وگنجینہ ہے۔
>
> اس سلسلہ میں ایک بات گوش گزار کرنا ضروری ہے، وہ یہ کہ خود حضرت والا اس کے مضامین کو کیف ما اتفق (جیسے اتفاق ہوتا گیا) نقل فرماتے گئے ہیں، اب چونکہ اس کے جملہ مضامین ہمارے سامنے ہیں اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ تفسیر، حدیث، فقہ ہر ایک عنوان کے تحت اس کے مناسب جو مضامین ہیں وہ یکجا درج کردئے جائیں، نیز چونکہ اکثر حضرات اردوخواں ہیں اس لئے عربی فارسی عبارات کا ترجمہ بھی کردیا جائے تاکہ سب لوگ منتفع ہوں، مگر بعض عبارات ایسی بھی ہیں کہ باوجود ترجمہ کے بھی عام لوگ نہیں سمجھ سکتے ان کا ترجمہ نہیں کیا جائے گا، بعینہٖ عبارت درج کردی جائے گی۔“

(۵) حالاتِ مصلح الامت:

یہی کتاب جامی صاحب کی مستقل تالیف ہے اور جتنی دلچسپی سے اس کو لکھا ہے، حضرتؒ کے بعد، حضرت کے علوم ومعارف کے علاوہ اور کسی چیز سے اتنی دلچسپی انھیں نہیں تھی، اور وجہ ظاہر ہے کہ جس ذات کی محبت ان کے رگ وریشہ میں اسی رچی بسی تھی جیسے پھولوں میں نم سحر، یہ کتاب اسی کا تذکرہ ہے۔ جب تک وہ شخصیت سامنے

رہی خود کو اس کے آگے فنا کئے رہے، اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی تو اس کا ذکر ہی روح کی غذا اور دل کی دوا تھا، جامی صاحب حالات لکھتے تھے، پڑھتے تھے، سناتے تھے، سنا کر اطمینان محسوس کرتے تھے، حالات کا سلسلہ ''معرفت حق'' میں ''وصیۃ العرفان'' میں سالہا سال چلتا رہا، قسطوں پر قسطیں تیار ہوتی جارہی تھیں، لوگ ٹوکتے کہ سوانح کا یہ کون سا انداز ہے؟ جامی صاحب اس کا کچھ خیال نہ کرتے، وہ سوانح حیات کہاں لکھ رہے تھے، وہ تو اپنے محبوب شیخ کی یادوں میں، ان کی محبت میں ڈوبے ہوئے تھے، انھیں یادوں کے چراغ جلائے رکھنا چاہتے تھے، اسی محبت کو تازہ دم رکھنا چاہتے تھے، انھیں ادنیٰ ادنیٰ مناسبتوں سے طول طویل تذکروں کو چھیڑ دینے میں لطف آتا تھا، معمولی معمولی جزئیات تک کو بڑے لطف وحلاوت سے بیان کرتے، ان کی زندگی انھیں یادوں کے سہارے خوشگواری سے کٹتی جارہی تھی، انھوں نے حالات کے ضمن میں شیخ کی تعلیمات اور ملفوظات ومعارف کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کردیا ہے، یہ کتاب جہاں حضرت کے احوال وواقعات کا مستند ترین ذخیرہ ہے، وہیں حضرت کے طریقۂ اصلاح، اندازِ تربیت اور افکار وعلوم کا دائرۃ المعارف ہے۔ حضرت کے معاصر علماء سے جو آپ کے تعلقات تھے اور باہم جو خط وکتابت ہوئی، جو بجائے خود ایک زبردست علمی ذخیرہ ہے اس کی پوری تفصیل اس کتاب میں جمع کردی گئی ہے، ان مکاتیب میں نفیس علمی وروحانی مباحث وتحقیقات ہیں بالخصوص حضرت مصلح الامتؒ اور ان کے استاذ علامہ محمد ابراہیم بلیاوی علیہ الرحمہ جو حضرت سے مجاز بیعت ہوئے، ان دونوں بزرگوں کے مکاتیب علم وتحقیق کے گرانقدر جواہر پارے ہیں، یہ عظیم الشان ذخیرہ حالات مصلح الامت کے ذیل میں اکٹھا ہوگیا ہے، اس سوانح کو اشرف السوانح کا نمونہ سمجھنا چاہئے، وہاں خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب حضرت تھانویؒ کے عاشق زار تھے تو یہاں یہ حضرت مصلح الامتؒ کے جاں نثار تھے، خواجہ صاحبؒ بھی ذرا ذرا سی

مناسبت سے بات میں بات پیدا کرتے چلے جاتے ہیں تو جامی صاحب بھی انھیں کے نقش قدم پر قصۂ عشق دراز کرتے چلے جاتے ہیں، گویا سوانح کے باب میں بھی حضرت حکیم الامت کی جانشینی ہاتھ لگی۔

حالات مصلح الامت کا آغاز جون ۱۹۷۱ء سے ہوا، ممکن ہے کہ درمیان میں چند مہینوں کا کبھی کسی وجہ سے ناغہ ہوا ہو، ورنہ وہ تسلسل کے ساتھ چھپتے رہے، اور آخری قسط نومبر ۱۹۸۹ء میں لکھی گئی، گویا اٹھارہ سال سے زائد مدت تک یہ سلسلہ چلتا رہا، ہر ماہ کم از کم آٹھ صفحے شائع ہوتے تھے، میرے سامنے سوانح کے تمام صفحات نہیں ہیں، لیکن اتنا بالیقین ہے کہ مکمل کتاب کے تقریباً ۱۸؍سو صفحات ہیں جن کو اگر کتابی صورت میں شائع کردیا جائے تو چار ضخیم جلدیں ہوں گی۔

مولانا جامی صاحب کا یہ زبردست کارنامہ ہے، یہ سارا ذخیرہ ’’معرفت حق‘‘ اور ’’وصیۃ العرفان‘‘ کے شماروں میں موجود ہے، بلکہ اس کے کتابت شدہ فرمے بھی موجود ہیں، ان میں قدرے تصرف کرکے کتابی صورت میں شائع کردیا جائے تو حضرت مصلح الامت کے حالات، ان کی سیرت، ان کے مزاج، ان کی خصوصیات اور ان کی تعلیمات وہدایات کا ایک مکمل انسائیکلوپیڈیا لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگا۔ حق تعالیٰ غیب سے اس کا انتظام فرمادیں۔ (الحمدللہ ’’حالات مصلح الامت‘‘۔۔۔مکمل طبع ہوکر منظر عام پر آچکی ہے)

(۶) تنویر السالکین ترجمہ تنبیہ الغافلین:

فقیہ ابواللیث سمرقندیؒ کی شہرۂ آفاق تالیف ’’تنبیہ الغافلین‘‘ ترغیب وترہیب کے موضوع پر ایک کامیاب کتاب ہے، حضرت مصلح الامت کی وفات کے بعد جامی صاحب حضرت قاری محمد مبین صاحب کی عدم موجودگی میں کبھی کبھی اس کتاب کو سامنے رکھ کر اس کا ترجمہ بیان کرتے تھے، اس کے مضامین کی تاثیر اور افادیت کے پیش نظر

خیال ہوا کہ اس کا سلیس ترجمہ وصیۃ العرفان میں قسط وار شائع کر دیا جائے، چنانچہ اللہ کا نام لے کر جولائی ۱۹۸۲ء سے اس کی اشاعت قسط وار شروع کر دی گئی، اور اس کا سلسلہ وفات کے بعد تک چلتا رہا، غالباً پوری کتاب کا ترجمہ نہ ہو سکا مگر جتنا ہو چکا ہے وہ خود ایک ضخیم جلد ہے، اس کا مقدمہ جامی صاحب نے بہت عمدہ تحریر فرمایا ہے جس کا لفظ لفظ شکر گزاری کا مرقع ہے، اور چونکہ کسی کتاب کی تمہید اور مقدمہ کی حیثیت سے یہ ہم مولانا کی آخری تحریر ہے اس لئے بہت موثر اور دل آویز ہے، جامی صاحب کی سیرت وطبیعت اس طرح جھلکتی ہے جیسے صاف وشفاف آبگینہ میں پانی۔ ناظرین اسے ضرور ملاحظہ فرمالیں، فرماتے ہیں:

> ”**الحمد للہ لاهله والصلوٰة لاهلها ، امابعد** : احقر مترجم عبدالرحمٰن جامی بن سراج الحق مچھلی شہری ثم الہ آبادی ناظرین باتمکین کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ”اگر تم میری نعمتوں کا شکر ادا کرو گے تو میں تمہیں نعمتیں اور زیادہ دوں گا“ **لئن شکرتم لازیدنکم** ۔ اور یہ امر بھی مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں ہم پر ہیں وہ بے حد و بے شمار ہیں **وإن تعدوا نعمة اللہ لا تحصوھا** ، پس ایک عاصی و عاجز اور فانی انسان سے اللہ تعالیٰ کی غیر متناہی نعمتوں کا شکر ادا ہو تو کیونکر ہو؟
>
> ایک کتاب میں اس مسئلہ کا یہ حل نظر سے گذرا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی حق تعالیٰ سے دریافت کیا تھا کہ اے رب! آدم علیہ السلام نے آپ کے ان سب احسانات کا شکر کیسے ادا کیا؟ جو آپ نے ان پر فرمائے اور اس فریضہ سے وہ کیونکر عہدہ برآ ہو سکے، مثلاً یہ کہ ان کو آپ نے اپنے دست مبارک سے بنایا، اپنی روح ان کے اندر پھونکی، انھیں اپنی جنت میں ٹھہرایا، اور تمام فرشتوں کو حکم فرمایا کہ وہ سب ان کا اکرام و تعظیم بصورت سجدہ کریں وغیرہ وغیرہ، ارشاد ہوا کہ

اے موسیٰ! آدم نے اس بات کا اعتراف کیا اور جان لیا کہ یہ سب انعامات جو ان پر کئے گئے ہیں وہ سب میں نے ہی کئے ہیں، اور اس پر انھوں نے میری حمد کی، بس یہی ان کی جانب سے میری تمام نعمتوں کا شکر تھا۔

الحمد للہ اس روایت سے اللہ تعالیٰ کے شکر ادا کرنے کا طریقہ اور سلیقہ ہاتھ لگا چنانچہ میں بھی سب سے پہلے اپنے خالق و مالک کی حمد کرتا ہوں اور شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے انسان بنایا، اور انسانوں میں کافر بھی تھے اور مسلم بھی، پس دوسرا اس پر کہ اس نے مجھے مسلمان بنایا ؎

آدمیت دادۂ بعدم مسلماں کردہ ای
اے خدا قرباں شوم احساں براحساں کردہ ای

پھر اس پروردگار کا شکر اس پر کہ مسلمانوں میں سے اس نے مجھے اہلسنت والجماعت سے وابستہ فرمایا، اور اس کے بعد مزید کرم یہ کہ جماعت اہلسنت میں سے اس نے ہمیں شریعت ظاہرہ کی رو سے حنفی المسلک بنایا اور طریقت کی رو سے سلاسل اربعہ سے مستفیض فرماتے ہوئے خصوصی طور پر حضرات چشت اہل بہشت کے مسلک سے سیراب فرمایا، پھر ہند میں علمی فیض کے لئے خاندان ولی اللّٰہی اور خوان قاسمی سے حصۂ وافر عطا فرمایا، فیض روحانی کے لئے خاندان امداد اللّٰہی سے مستفید ہونا مقدر فرمایا، اور اس بحر سے نکلی ہوئی نہر اشرفی کو ہمارا مشرب ہونا تجویز فرمایا، چنانچہ حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے بعد ان کے کامل وصادق جانشین مرشدی ومولائی حضرت اقدس مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری ثم الہ آبادی سے تعلق کو ہمارے لئے باعث صد افتخار بنایا اور عرصۂ دراز تک ان کی غلامی میں رکھا، اور مزید عنایت یہ فرمائی کہ ان کے خوانِ نعمت سے باطنی اور روحانی غذا کھلا کر اس کی بھی توفیق بخشی

کہ جب کروں تو انھیں کی بات کروں، اور جب سنوں تو انھیں کی بات سنوں۔

ماہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیثِ یار کہ تکرار می کنیم

اور الحمدللہ اس باب میں راقم کو ایسا یکسو رکھا کہ کسی کی مجال نہیں کہ وہ حضرت نور اللہ مرقدہ کے احسان فراموشی کا طعنہ ہمیں دے سکے، **وذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء**، اس کو بھی عمل نہیں خدا کا فضل سمجھتا ہوں، شاید یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مصلح الامت نور اللہ مرقدہ کے حالات وملفوظات کی اشاعت میں نمایاں حصہ اس ظلوم وجہول اور ہیچمداں کے نصیب میں رکھا۔

اس کے بعد مولانا نے اجمالاً ان کتابوں کا ذکر کیا ہے جن کا تعارف پہلے ہو چکا ہے، یہ تحریر جامی صاحب کی زندگی کا خوبصورت مرقع ہے، اور جس دعاء کی بار بار ابتداء میں بزرگوں سے درخواست کرتے تھے یہ اس کی قبولیت کا شکر واعتراف ہے، ابتداء وہ تھی کہ دوڑ دوڑ کر بزرگوں کا دامن پکڑتے تھے کہ جماعت اہل حق سے وابستگی نصیب ہو، اور انتہا یہ کہ اس جماعت اہل حق کی وابستگی کا شکر ادا کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہونے کا سروسامان کر رہے ہیں۔ **وذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم**

◆ ◆ ◆ ◆ ◆

باب ۱۵

وفات اور اولاد

سابقہ سطور میں یہ بات گزر چکی ہے کہ جامؔی صاحب کافی عرصہ سے علیل چل رہے تھے، کسی نہ کسی عنوان سے بیماری کا سلسلہ چل ہی رہا تھا، لیکن آخر کے ایام میں بالکل ہی صاحب فراش ہوگئے تھے۔ ۱۹۸۹ء میں میری حاضری ہوئی تو بالکل معذور تھے، خود سے حرکت کرنا بھی دوبھر تھا، جوڑوں کے درد اور ورم کی شکایت تھی، پاؤں میں شدید زخم تھا، یہ سلسلہ تو تھا ہی مگر وہ بیماری جو مولانا کی وفات کا بہانہ بنی، کل چھ روز رہی۔ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ کا شروع ہو چکا تھا، معذوری کے باوجود چار روزے رکھ چکے تھے، افطار کے بعد ۲۲/ مارچ ۱۹۹۱ء کو اچانک قے دست بہت ہوئے، علاج ہوا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا، ۲۴/ کو بلڈ پریشر دیکھا گیا تو بہت گرا ہوا تھا، گردے بھی اپنا کام بند کر چکے تھے، اس لئے ۳/ دن سے پاخانہ پیشاب نہیں ہوا تھا، ڈاکٹر نے میڈیکل کالج چلنے کے لئے کہا، مگر مولانا نے اسپتال جانے سے انکار کر دیا، گھر پر ہی علاج معالجہ ہوتا رہا، ۲۶/ مارچ سہ پہر سے غنودگی شروع ہوئی اور آواز بھی بند ہوگئی۔

شب میں حالت میں زیادہ تغیر ہوگیا، اب وقتِ موعود آپہونچا تھا، دنیا سے بے خبری شروع ہو چکی تھی اور آخرت کی جلوہ ریزی کا آغاز ہوگیا تھا، دنیاوی تدبیریں ناکام ہو رہی تھیں اور خدا کی تقدیر تیزی سے کام کر رہی تھی، لیکن شریعت کی پابندی اور نماز کا اہتمام جس کے وہ بچپن سے عادی تھے، اس نیم بے ہوشی کی حالت میں بھی حق

تعالیٰ نے مدد فرمائی، نماز فجر اشارے سے ادا کی۔ ۱۴۱۱ھ کے رمضان شریف کا عشرۂ رحمت تکمیل کو پہونچ رہا تھا، یعنی ماہِ مبارک کی ۱۰ر تاریخ تھی، عیسوی سن کے لحاظ سے ۱۹۹۱ء کی ۲۷ر مارچ تھی کہ رحمتِ حق کا بلاوا آ گیا۔

بعد نماز فجر نزع کی کیفیات ظاہر ہونا شروع ہوئیں، فرزند ارجمند حافظ مولوی محی الدین سلّمہٗ بآوازِ بلند سورۂ یٰسین شریف کی تلاوت کرنے لگے، پیشانی پر ہاتھ رکھا تو عرق آلود تھی، حدیث شریف کی بشارت ہے کہ: المومن یموت بعرق الجبین (مومن کو موت آتی ہے تو پیشانی عرق آلود ہوتی ہے) یہ کیفیت بشارت دے رہی تھی کہ دنیا کو الوداع کہنے والا خدا کے حضور ایمان سلامت لے جا رہا ہے، عمر بھر کی کمائی کام آ رہی ہے، چنانچہ دو بار کلمۂ شہادت بآواز بلند پڑھا، اپنے ایمان پر حاضرین کو گواہ بنایا اور سورہ یٰسین جونہی پوری ہوئی زندگی بھر کی رفیق جس کا چلنا زندگی کی علامت تھا یعنی سانس اس نے بھی اپنی آخری آمد پوری کی اور اپنے رب کی طرف لوٹ گئی۔ وقت سوا چھ بجے صبح کا تھا جب زندگی کی شام آئی۔ یَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ إِرْجِعِيْ إِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ۔

ایک تو پیٹ کا مرض خود ''المبطون شهيد'' کے تقاضے سے شہادت سے سرفراز کر رہا تھا، دوسرے رمضان المبارک کا مقدس و پُر رحمت مہینہ، کیسی خوش نصیب موت ہوئی۔

جنازہ کی نماز مولانا عرفان احمد صاحب داماد حضرت قاری محمد مبین صاحب مدظلہٗ نے پڑھائی، حضرت قاری صاحب اس وقت بمبئی میں تھے۔ وقت کے مشہور بزرگ حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب قدس سرہ باوجود ضعف وعلالت اور پیرانہ سالی کے جنازہ میں شریک رہے، محلہ اکبر پور میں جہاں مولانا جامؔی صاحب کے اتالیق ومربی حضرت مولوی دادا علیہ الرحمہ آرام فرما ہیں وہیں ان کیلئے بھی ابدی خوابگاہ تجویز

ہوئی، اسی قبرستان میں حضرت مصلح الامت علیہ الرحمہ کی دو صاحبزادیاں بھی مدفون ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب پاک نفوس پر اپنی رحمت نازل فرمائیں اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائیں۔

اولاد: مولانا سراج الحق صاحب علیہ الرحمہ کے حالات میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ اولاد کے باب میں مولانا نہایت خوش قسمت تھے، باپ کی یہ خوش قسمتی بیٹوں کے حصے میں بھی آئی۔

مولانا جامؔی کے دو نکاح ہوئے، پہلی اہلیہ سے ایک صاحبزادی ہیں، ان کی وفات کے بعد ان کی چھوٹی بہن سے نکاح ہوا، ان سے آٹھ اولادیں ہوئیں، دو بیٹے، چھ بیٹیاں۔ ایک بیٹے کا خوردسالی میں وصال ہوگیا۔ اب ماشاء اللہ سات بیٹیاں اور ایک بیٹا موجود ہے، سب بیٹیاں اپنا اپنا گھر آباد کر چکی ہیں۔ صاحبزادے عزیزم مولوی حافظ محی الدین سلّمہٗ، جو نیکی اور سنجیدگی میں اپنے والد کی یادگار ہیں، حفظ کی تکمیل کے بعد متوسطات تک مدرسہ وصیۃ العلوم الہ آباد میں اپنے والد ماجد اور حضرت قاری صاحب مدظلہ کی سرپرستی میں تعلیم حاصل کی، اور پھر مظاہر علوم سہارنپور جا کر تعلیم کی تکمیل کی۔

اپنی والدہ ماجدہ کی خدمت جان و دل سے کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی عمر اور علم و عمل میں برکت عطا فرمائیں اور ہمیشہ خوشحال و مطمئن رکھیں۔

✿✿✿✿✿

عزیزم مولوی احمد متین سلّمہٗ بن حضرت قاری صاحب مدظلہ و نبیرہ حضرت مصلح الامتؒ نے وصیۃ العرفان میں حضرت مولانا جامی صاحب علیہ الرحمہ کی وفات پر بہت موثر ادارتی نوٹ لکھا ہے، اسے ملاحظہ فرمائیں۔ اس کے بعد حضرت مولانا قاری شاہ محمد مبین صاحب دامت برکاتہم کا مکتوب گرامی پڑھیں جس کا لفظ لفظ انتہائی پُرخلوص محبت اور حد درجہ درد و غم کا آئینہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جہاں جامی صاحب نے

عہد وفاداری کو نباہ دیا، وہیں حضرت قاری صاحب مدظلہ نے بھی حق تعلق و محبت ادا کردیا، **جزاھما اللہ خیر الجزا**

آخر میں حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب مدظلہ کا مولوی محی الدین سلّمہٗ کے نام "تعزیت نامہ" بھی ملاحظہ فرمالیں جو سراسر شفقت و نصیحت اور خیر خواہی کا مرقع ہے۔

* * *

ویراں ہے میکدہ خم وساغر اداس ہیں

جناب مولانا احمد متین صاحب نبیرہ حضرت مصلح الامتؒ

مصلح الامتؒ عارف باللہ مولانا شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ کے متوسلین، معتقدین، قریب ودور کے متعلقین ہر کسی کی زبان پر آنے والے اور ہر دل میں بسنے والے جامؔی صاحب (یعنی مولانا عبدالرحمٰن جامؔی نور اللہ مرقدہ) ہائے اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ سچ ہے بزم ہستی میں کوئی نہیں رہا۔ یہ کائنات اور اس کی ہر شئے فنا ہونے والی ہے، سب کا حال ’’فقیرانہ آئے صدا کر چلے‘‘ کا رہا ہے۔ اسی ابدی اور اٹل نظام کے تحت انسان اپنے جگر پر پتھر رکھ کر کیسی کیسی محبوب ترین ہستیوں کو ویرانہ میں سپرد خاک کر کے چلا آتا ہے، کل تک جو آنکھوں کا تارا تھا آج سناٹے میں کچی تربتوں کے حوالے۔ جگر پر آرا چلے، دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے مگر نعمت وامانت دینے والے کا اعلان یہی ہے: إِنَّ أَجَلَ اللهِ إِذَا جَاءَ لَايُؤَخَّرُ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ، خدا کا مقرر کردہ وقت موعود جب آجاتا ہے تو ٹلتا نہیں، کاش کہ تم سب جانتے ہوتے۔ اللہ کی اس مرضی کے آگے ہم ناتواں بندوں کا سر تسلیم خم ہے، انا للہ وانا إلیہ راجعون۔

یہاں بے ساختہ سیّدۃ النساء فاطمہ زہراء کا درد بھرا جملہ تڑپا دیتا ہے جب حضرت انس رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے جسد اطہر کو سپرد خاک کر کے سیّدۃ النساء کے حجرے سے گزرے، صاحبزادی محترمہ رضی اللہ عنہا نے انھیں لوٹتے دیکھا تو فرمایا: یا انس

كيف طابت أنفسكم أن تحثوا التراب علىٰ رسول الله ﷺ، اے انس! تم لوگوں نے کس دل سے رسول اکرم ﷺ کے جسد اطہر پر مٹی ڈالنا گوارا کیا؟ ہما وشما کا کیا ذکر، درد کی اس منزل، انسانی رشتے کے اس صبر آزما مرحلے سے سبھی انبیاء واولیاء کو گذرنا پڑا، اور یہی ہے بے بس انسان کی بے بسی اور بے کسی اور یہیں آ کر قادر مطلق کی چوکھٹ پر تسلیم ورضا کا سر جھک جاتا ہے، **رضينا بالله رباً وبالاسلام ديناً وبمحمدٍ ﷺ نبياً۔**

اس حقیقت سے تو کسی کو انکار نہیں کہ اس سرائے فانی سے سبھی کو جانا ہے، آج ان کی تو کل ہماری باری ہے۔ تسلیم ورضا مومن کا شعار ہونا چاہئے، مگر بایں ہمہ مفارقت کا داغ، جدائی کا صدمہ، بڑا ہی جاں گسل، روح فرسا اور صبر شکن ہوتا ہے۔ سیّد المرسلین ﷺ کی شخصیت، پہاڑ جیسا صبر وضبط، سمندر جیسا حوصلہ مگر غم والم کے موقع پر لسانِ نبوت سے نکلے ہوئے یہ جملے سنائی دیتے ہیں: **إنا بفراقك يا إبراهيم لمحزونون......القلب يحزن والعين تدمع۔**

(۲) مولانا مرحوم (اور کیا بتایا جائے کہ مرحوم لکھنے میں کیسی ضربِ کاری لگی ہے) ایک طویل عرصہ سے گٹھیا کے قدیم مرض میں مبتلا تھے، مرض نے ادھر چند سالوں سے بڑھ کر انھیں صاحب فراش بنا دیا تھا، اور وہ دونوں پیروں گھٹنوں سے معذور ہو چکے تھے ان کی زندگی کا میدان صرف چارپائی تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ درد، ٹیس، ٹپکن، مواد، پیپ کا تسلسل جو پہلے کبھی کبھی ہو جاتا تھا، اب جزو لاینفک بن کر رہ گیا تھا۔ مختلف ڈاکٹروں، حکیموں سے رجوع کیا گیا، آخر بمبئی کے ہسپتال میں زیر علاج رہے، مگر ان کی کمزوری، معذوری، اور ضعف میں اضافہ ہوتا چلا گیا، اور مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، بالآخر ۱۹۹۱ء مطابق ۱۴۱۱ھ، رمضان المبارک کا مہینہ آ گیا، عالی ہمت اور بلند حوصلہ تو تھے ہی، روزہ رکھ لیا، چوتھے روزے کو افطار کے بعد دست وقے کی شکایت

شروع ہوگئی ، یہ سلسلہ چلتا رہا اور چند دنوں کے بعد گردہ نے اپنا عمل بند کردیا، اور پیشاب بھی رک گیا، مقامی معالج نے میڈیکل کالج چلنے کے لئے زور دیا، مگر مولانا (مرحوم) اسپتال جانے کے لئے راضی نہیں ہوئے، ڈاکٹر سے کہا کہ آپ سے جو کچھ ہوسکے یہاں علاج کردیجئے ، اسپتال نہ جائیں گے ، چنانچہ گھر ہی پر گلوکوز چڑھانا شروع کردیا گیا، اور بھی دوائیں جاری ہوگئیں، انجکشن دیا جانے لگا اور وہ مختلف مراحل سے گذرتے رہے تا آنکہ ۲۶/ مارچ تیسرے پہر سے کچھ غنودگی رہنے لگی اور بولنا بھی بند ہوگیا۔ حالات دیکھ کر ڈاکٹر نے تشویش کا اظہار کیا انھوں نے بتایا کہ گردوں کے کام نہ کرنے کی وجہ سے پیشاب کا زہر خون میں شامل ہوچکا ہے جس کی وجہ سے غنودگی بڑھ رہی ہے، اور بھی مزید تدابیر اختیار کی گئیں مگر وہ اس منزل پر پہونچ چکے تھے جہاں ہر تدبیر الٹی ہوجاتی ہے اور دوا اپنا اثر چھوڑ دیتی ہے۔ بالآخر ۲۶/ مارچ کی درمیانی شب پیٹ کافی پھول گیا، سینہ میں بلغم کی زیادتی کی وجہ سے سانس مشکل سے لے رہے تھے، اسی اثناء میں کلمۂ شہادت زور سے پڑھا اور ۲۷/ مارچ ۱۰/ رمضان المبارک کی نماز فجر اشاروں سے ادا کی ، بعد نماز فجر تقریباً سوا چھ بجے جان جاں آفریں کے سپرد کی۔ **انا للہ وانا إلیہ راجعون۔** آہ فضا سوگوار ہے، اور مدرسہ و ادارہ کی ہوا نمناک!

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں

(۳) ادارۂ وصی اللّٰہی نے تعلیمات مصلح الامتؒ کے اس ترجمان کے جانے سے زہر غم کا جیسا پیالہ نوش کیا ہے اور جو درد و کسک محسوس کی ہے وہ ناقابل بیان ہے، وہ اہل خانہ و ادارہ ہوں یا متوسلین و متعلقین ہوں سبھی کی نظریں مدت تک انھیں ڈھونڈھیں گی اور سبھوں کا دل ان کو پکارے گا ، مگر افسوس جس منزل پر اب وہ گئے ہزار تڑپ اور اضطراب کے بعد بھی ملنے والے نہیں۔ ع

اب انھیں ڈھونڈھ چراغِ رخِ زیبا لے کر

نظریں انھیں انگلیوں کو ڈھونڈھیں گی جو مرض گٹھیا سے شل ہوگئی تھیں، مگر قلم تعلیمات شیخ کی نشر واشاعت میں چلتا رہا۔ دل اسی کو پکارے گا جو کسی کی صہبائے محبت میں سرشار تھا۔ ؎

اے تیر غمت را دل عشاق نشانہ　　　خلقے بتو مشغول وتو غائب زمیانہ

(۴) مصلح الامت نانا جان مرحوم کے وصال کے بعد تلخ، کڑوے، کسیلے حالات وانقلابات سے یہ ادارہ اور مدرسہ گذرتا رہا، شرور وفتن کی آندھیاں چلیں، نوع بہ نوع کے تکلیف دہ آزمائشی مراحل آتے جاتے رہے، کتنوں کے قدم، قلم، بہکے، پھسلے، بھٹکے، مگر مولانا مرحوم کی استقامت بدستور اپنے حال پر رہی، قدم قدم پر ثبات ویک در گیر ومحکم گیر کا مظاہرہ، وہی جذبہ، وہی رنگ جنوں اور نہ اترنے والا نشہ ؎

موجِ خوں سر سے گذر جائے نہ کیوں　　　آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا!

وہ اپنے شیخ ومربی کی تعلیمات وفرمودات اور مکتوبات کے نشر واشاعت کی دُھن میں لگے رہے۔ بیماری نے انھیں صاحب فراش بنادیا، تکلیف وبے چینی کروٹ کروٹ تھی، مگر بیٹھ کر، پھر لیٹ کر، بعد ازاں املا کرا کرا کر لکھتے رہے، محبت، زہر مشقت کا ہر گھونٹ گوارا کرتی رہی، بالآخر قلم کا یہ مسافر تھک کر سوگیا، اور سرمایۂ عمر اسی دَر پر نثار کرگیا ؎

جان ہی دیدی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

ان کا خامہ تو نہیں انگلیاں ضرور بے کار وفگار تھیں اور انھیں شکستہ انگلیوں سے وہ قلم چلاتے رہے، ان کے اعصاب جواب دے چکے تھے، جسم کا جوڑ جوڑ ہل چکا تھا، مگر مصلح الامت سے عشق ومحبت کی کارفرمائیاں اپنا جلوہ بکھیرتی رہیں، اور مقصد کی خلش جب دل میں چبھ گئی ہو اور دل ودماغ گلشن محبت کے پھولوں سے معطر ہو تو آبلہ

پائی و شکستگی کا احساس کیا معنی؟

گل در دماغ می دمد آسیب خار چیست؟

انھیں حالات وکوائف میں سیّدنا مصلح الامت قدس سرہٗ کے ارشادات وفرمودات کا دفتر تیار ہوتا رہا، کبھی ''معرفت حق'' کی صورت میں، کبھی ''وصیۃ العرفان'' کی شکل میں۔ حضرت والا قدس سرہ کی سوانح حیات بھی مرتب ہوتی رہی اور پایۂ تکمیل کو پہونچی، ادھر ان کی جسمانی صحت کا زوال بھی تیزی پر تھا، اور معذوری بھی روز افزوں! مگر ہمت جواں تھی اور جذبہ سرشار وسرمست، کوئی عذر بھی ان کے کاروانِ شوق کو روک نہ سکا۔ ؎

جلوۂ کاروانِ مانیست بناقہ وجرس
شوق تو راہ می بَرد دردِ تو زادمی دہد

(۵) ایسی شخصیتیں لیل ونہار کی اللہ جانے کتنی گردشوں کے بعد پیدا ہوتی ہیں، وہ اپنا خونِ جگر دیتی ہیں تو بہار پھیلتی ہے، کسی کی چوکھٹ پر تن من قربان کرنا، عمر عزیز گزار دینا اس کی زندگی میں تو سہل ہے مگر حیات کے بعد جگر کو مار کر، نفس کو کچل کر تعلقات کو نبھانا، حق نمک ادا کرنا، بے لوث خدمت بجالانا، ہر کسی کے بس کا نہیں، باتیں کرلینا، بنالینا، دعویٰ ونسبت کا اظہار آسان ہے مگر اس عشق کی تواضع خونِ جگر سے کرنی ہوتی ہے، تواضع واخلاص کے وزن سے انانیت وخودسری کے بت کو توڑنا ہوتا ہے تب جاکر کبر ونخوت کا دفتر بے معنی غرق ہوتا ہے اور خاکی پُتلے کے اندر وہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ اپنے ناتوان دوش پر بارِ امانت سنبھال لیتا ہے۔

آج مصلح الامت کی تعلیمات وفرمودات کے جو ذخائر آپ کے سامنے ہیں، جو پڑھ چکے ہیں اور پڑھ رہے ہیں (اور آئندہ بھی پڑھتے رہیں گے) یہ اسی اللہ کے مخلص بندے کی کرامت ہے اور اسی کی کوششوں کا ثمرہ ونتیجہ ہے، انھوں نے اپنے

ساقی (میری مراد جد امجد مولانا شاہ وصی اللہ نور اللہ مرقدہٗ سے ہے) سے جامِ ارغواں کشید کیا تھا، مدت العمر اس کے خمار میں مست وسرشار رہے، جمالِ یار آنکھوں میں رچ بس گیا اور دل میں ایسا کھب گیا کہ نظر ماسوا پر پڑی ہی نہیں، صحبت شیخ میں رہ کر شیخ سے قیامت کا ربط ہو گیا تھا، اس ربط وتعلق نے تحریر میں بھی مصلح الامت کی جھلک پیدا کردی تھی اور انہی کا عکس نور ہویدا تھا، اسی بنا پر متعلقین وقارئین ان کی تحریر کو پسند کرتے تھے اور لذت اٹھاتے تھے کہ ان کے سوادِ خط میں جمالِ شیخ نظر آتا تھا ؎

اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری

(۶) مولانا مرحوم اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، ان کا ذہن بیدار، طبیعت ہشیار اور دماغ سدا بہار تھا، کبھی ان کی تکالیف ان کی دماغی بشاشت پر اثر انداز نہیں ہوئیں۔ بیدار مغزی اور علمی استحضار کا یہ عالم تھا کہ دورانِ مرض وفات، رِحلت سے صرف چند روز قبل جب وہ سفرِ آخرت کے لئے پَر تول رہے تھے مولانا عرفان احمد صاحب (داماد حضرت مولانا قاری محمد مبین صاحب دامت برکاتہم) سے کسی شرعی مسئلہ پر دیر تک گفتگو فرماتے رہے، سوال وجواب کا سلسلہ چلتا رہا، جسمانی امراض واعذار لاکھ سہی مگر جب دل ہی زندہ وبیدار ہو اور باطن میں اللہ کے کسی ولی کا جلوہ کارفرما ہو تو فیض وہدایت کے چشمے یونہی پھوٹتے رہتے ہیں ؎

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

(۷) ادھر عمر عزیز کے چند سالوں میں مرض ومریض کو سن کر جب کوئی برائے عیادت جاتا تو امراض وآلام کے اس مسلسل اور پے در پے ہجوم کے بعد بھی ان کی دلنواز مسکراہٹ میں کوئی بخل نہ ہوتا، بذلہ سنج فطرت، ظرافت میں ڈھلی طبیعت بذلہ سنجی وشگفتگی سے باز نہ آتی۔ وہی مسکراہٹ، وہی ظرافت اور صبر وسکون کا فطری مظاہرہ،

چھوٹے چھوٹے برجستہ، شائستہ، دلچسپ، خوش کن چٹکلے اور جملے، نہ امراض کی شکایتوں کی طویل فہرست اور نہ رنج والم کا شکوہ وافسانہ، کبھی ایسا ہوتا کہ وہ اپنی تکلیف ظرافت کے انداز میں بیان کرتے جاتے اور ہنستے ہنساتے جاتے، ایسا محسوس ہوتا گویا ان کی خواہش ہے کہ عیادت کرنے والا ان کی المناکیوں سے آزردہ دل اور شکستہ خاطر نہ ہو۔ اللہ اللہ، تیرے محبوب بندوں کی یہ شان؟ یہی وہ شان ہے جس پر شاہانِ دنیا قربان!

(۸) اس حادثۂ جانکاہ سے اہل خانہ کا متاثر ہونا فطری امر ہے، اور فطرت کو کون بدل سکتا ہے۔ اللہ رب العزت پسماندگان کو صبر سکینت ودیعت فرمائے، ادھر والد ماجد مولانا قاری شاہ محمد مبین صاحب مدظلہ کے دل کو جو صدمہ پہونچا اور ٹھیس لگی...... یقیناً...... اہل خانہ تعزیت کے مستحق ہیں، مگر والد محترم کا استحقاق بھی ان سے کم نہیں، حق تعالیٰ غیب سے نعم البدل عطا فرما کر ان کی دلجوئی فرمائے، آمین۔

(۹) مصلح الامت نانا جان کی وفات کے بعد مولانا مرحوم کے لئے سب کچھ والد محترم ہی تھے، نیز والد ماجد کے لئے بھی مولانا مرحوم ایک بہت بڑا سہارا اور ڈھارس کا ذریعہ تھے، دونوں ہی شخصیتیں ایک دوسرے لئے باعث تقویت اور یک جان دوقالب تھیں، ایک جانب وہ تعلیمات مصلح الامت کی نشرواشاعت (۱) میں لگے رہے، دوسری جانب والد ماجد حسب طاقت وحیثیت ان کی ہر طرح خدمت ودلجوئی کرتے رہے،

---

(۱) شاید یہی احساس تھا جس نے خود مولانا جامیؔ صاحب مرحوم کی زبان سے بھی ان کے زمانۂ علالت میں یہ دوشعر کہلا دیئے تھے ؎

رسالہ ہو، سوانح ہو کہ حضرت کی کتابیں ہوں
پڑھیں گے اور کریں گے تجھ کو یاد اہل نظر برسوں
وہ مجلس ہو کہ دفتر ہو کہ جامیؔ درسگاہیں ہوں
تجھے ڈھونڈھا کریں گے گھر کے سب دیوار ودر برسوں

اس طرح میخانۂ تصوف کا نظام چلتا رہا۔ غرض ربط وتعلق، خدمت کی آگ دونوں ہی طرف سے لگی رہی، البتہ انداز خدمت میں ضرور فرق رہا، رب العزت ان دونوں ہستیوں کو اجر عظیم سے نوازے۔

کسی بڑی ہستی کے چلے جانے کے بعد جگہ کو سنبھالنا، خلا کو پُر کرنا بڑے ہی دل گردے کا کام ہوتا ہے، مصلح الامت رحمۃ اللہ علیہ کے بعد والد ماجد کا صبر واستقلال اور مولانا مرحوم کی معیت رنگ لائی اور دونوں نے جس خاموشی اور دلسوزی سے خدمت انجام دی وہ ہم سب کے لئے باعث صد رشک ہے، رب کریم ہم کو بھی اس دولت کا شمہ عطا فرمائے۔

اے باد بیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو
خاموشی ودلسوزی، سرمستی ورعنائی

(۱۰) جانے والا چلا گیا، مگر جاے جانے والے! رہتی دنیا تک جب جب مصلح الامت رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کی سطریں پڑھ کر اللہ کے کسی بندے کا دل ودماغ اللہ کی معرفت وعرفان سے معمور ہوگا اس کا ہدیۂ ثواب تجھ کو بھی ملے گا، تیری روح کو بلندی حاصل ہوگی، اور مراتب عالیہ میں اضافہ ہوتا رہے گا، اور کتنی خوش نصیب ہے وہ روح جو آخرت کے نعمتہائے عالیہ سے سرفراز ہوتی ہے۔ اِرۡجِعِیۡ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرۡضِیَّۃً فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبَادِیۡ وَادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ۔

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ مجھے

* * * * *

مکتوب گرامی

حضرت اقدس مولانا شاہ قاری محمد مبین صاحب دامت برکاتہم

عزیزم محی الدین سلّمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت مولانا جامیؔ صاحب کے وصال پُر ملال پر تم سبھی لوگوں نے صبر وتحمل سے کام لیا ہوگا اور اس پر قائم بھی ہوگے، ایسی جگہ تسلی کے کلمات لکھنا، پھر ہفتہ عشرہ تک پہونچے گا، غم کو مزید تازہ کرنا ہی ہوگا، اسی شش وپنج میں ہوں مگر دل نہیں مانتا، اپنا درد وغم کہاں نکالوں اور دل کو کیسے ہلکا کروں، اس لئے چند سطریں لکھ رہا ہوں۔

بشنو از نئے چوں حکایت می کند
وز جدائیہا شکایت می کند

بتاریخ ۱۰؍ رمضان المبارک بوقت صبح بذریعہ فون مشفقم ، رفیق سفر وحضر حضرت مولانا جامیؔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سانحہ ارتحال کی وحشت ناک اطلاع ملی، **انا للہ وانا إلیہ راجعون ۔ کل نفس ذائقة الموت** کے تحت مقام رضا بالقضا والقدر صبر وتفویض ہے جس کے ہم سبھی مکلّف ہیں، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور درجاتِ علیا نصیب فرمائے۔ آمین ثم آمین

عزیزم! وصال پُر ملال کی خبر پاتے ہی سارا گھر دم بخود ہوگیا، جملہ افراد گھر

کے اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھ گئے، ایک گونہ سکتہ کا عالم، یہ حالت رہی، ما ایم تحیر وخموشی

محی الدین! یہ لکھ رہا ہوں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ آنسو بہاؤں یا چند کلمات تسلی آمیز لکھوں۔ قلم رک رہا ہے اور آنسو رواں دواں ہونا چاہتا ہے مگر ضبط سے کام لینا ہر حال میں مفید ہے، اس لئے آنسوؤں کو روک رہا ہوں۔

آہ! مولانا جامیؔ صاحب! آپ گروہِ وصی اللّٰہی کے ایک زندہ دل انسان تھے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے علوم ومعارف کے شارح وترجمان تھے، اور اس حقیر کے لئے باعث تسلی وتقویتِ قلب وسکونِ دل تھے۔ حضرت والاؒ کے وصال کے بعد جامیؔ صاحب کا وجود میرے لئے ایک انمول سرمایہ تھا، وہ مسجد ومدرسہ وخانقاہ کی جان اور روح تھے، ان کے وصال پُر ملال پر جتنا بھی آنسو بہایا جائے کم ہے، اور بہت ہی کم ہے ؎

دل کے جانے کا شہیدیؔ حادثہ ایسا نہیں
کچھ نہ روئے آہ گر ہم عمر بھر رویا کئے

اور اگر روئیں بھی تو اس سے کیا ہوتا ہے، یہ کوئی دنیاوی منزل نہیں کہ رو گا کر اپنے روٹھے رفیق وصدیق کو منا کر بلالیں گے، جو آخرت کی منزل طے کر لیتا ہے وہ پھر لوٹ کر کہاں آتا ہے، کتنے کتنے اور کیسے کیسے انبیاء واولیاء آئے اور اپنا اپنا کام کر کے چل دیئے، پھر لوٹ کر کہاں آئے، رونے والے روتے رہے اور اظہارِ غم کرتے رہے مگر نا کام رہے ؎

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال   صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

آخر میں ضبط وتحمل ہی کرنا پڑا، اسی میں راحت ملی، مگر یہ سب سمجھتے ہوئے بھی دل پریشان ہے، بے حد رنج وغم ہے، رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ اس مرتبہ جب الہ آباد واپسی ہوگی تو جامیؔ صاحب سے ملاقات نہیں ہوگی، بس دل ٹوٹ جاتا ہے۔ ہائے افسوس! کیا معلوم تھا کہ پندرہ سولہ روز کے بعد ہمیشہ کے لئے ساتھ چھوڑ دیں گے، میں

نے یہ سوچ کر سفر کیا تھا کہ پھر ملاقات ہوگی، انھوں نے ایسا سفر کیا کہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئے۔

وَكُنَّا كَنَدْمَانَیْ جُذَیْمَةَ حِقْبَةً
مِنَ الدَّهْرِ حَتّٰی قِیْلَ لَنْ یَّتَصَدَّعَا

(اور ہم دونوں ایک مدت تک جذیمہ (بادشاہ) کے دونوں ہمنشینوں کی طرح ساتھ رہے یہاں تک کہ لوگوں نے کہا ان میں کبھی جدائی نہ ہوگی۔)

فَلَمَّا تَفَرَّقْنَا كَاَنِّیْ وَمَالِكاً
بِطُوْلِ اجْتِمَاعٍ لَمْ نَبِتْ لَیْلَةً مَعاً

(لیکن جب جدائی ہوئی تو ایسی ہوئی کہ گویا ہم نے اور مالک نے باوجود طویل ملاقات کے ایک رات بھی ساتھ بسر نہیں کی۔)

اللہ والے تھے، اللہ سے جا ملے، اپنے شیخ کے باوفا و فرمانبردار مخلص مرید تھے، حضرت والا سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کیا اور خوب کیا۔

امانت عشق کی بعد اپنے کیا جانیں ملے کس کو
نہیں معلوم جائے کس کے سر یہ دردِ سر اپنا

جب تک اس دنیا میں رہ کر کام کرنا تھا حضرت والا کی حیات میں بھی اور بعد ممات بھی حضرت والا کے ارشادات و ملفوظات کی نشر و اشاعت کرتے رہے، لیکن نہ مسکن بدلا نہ خیالات بدلے، نہ افکار و اطوار۔ مودت اہل صفا چہ در رُو چہ در قفا۔ حضرت والا کی جدائی کا زمانہ جوں جوں طویل ہوتا گیا یوں یوں آپ کے جوڑوں کی تکلیف باوجود دوا علاج کے شدت پکڑتی گئی، معذوریاں بھی بڑھتی گئیں، حال یہ ہو گیا کہ:

ع تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

مگر واہ رے صبر و تحمل اور محبت شیخ کہ کام کرنے کا داعیہ اور شوق و ذوق سب

پر غالب رہا، اسی انداز، اسی دھن سے کام کرتے رہے، حسن اتفاق کہ حضرت مصلح الامتؒ کی سوانح کا کام بھی اختتام کو پہونچ رہا تھا ادھر ساتھ ہی ساتھ آپ کا سفر حیات بھی لحظہ بہ لحظہ اپنی منزل طے کر رہا تھا، معمولی سے وقفہ سے دونوں کا خوب سنگم ہوا، اور ایک سعادت مند مخلص مرید، معرفت حق، وصیۃ العرفان وسوانح کا دفتر بغل میں دبائے ہوئے اپنے حضرت مصلح الامتؒ کو اپنی کارگذاری دکھانے کے لئے حضرت والا کی خدمت میں ہمیشہ کے لئے جا پہونچا۔ کتنی مسرور ہو کر دونوں روحیں بغل گیر ہوئی ہوں گی۔ حضرت مصلح الامتؒ سے جو قلبی تعلق اور لگاؤ تھا، اس تعلق کی بنا پر امید ہے کہ حضرت اقدس کی روح بھی جنازہ میں شریک ہوئی ہوگی۔ ؎

بچہ ناز رفتہ باشد ز جہاں نیاز مندے
کہ بوقت جاں سپردن بسرش رسیدہ باشی

اور یہ بھی پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور بالکل صادق آتا ہے۔ ؎

منگر کہ دلِ ابن یمیںؔ پُرخوں شد   بنگر کہ ازیں سرائے چوں شد
مصحف بکف و پا بہ رہ و دیدہ بہ دوست   با پیک اجل خندہ زناں بیروں شد

بعد قیام فتحپور تال نرجا، اعظم گڈھ جو کہ حضرت والا ہی کے ساتھ تھا، یہاں الہ آباد میں سفر آخرت کی تین منزلیں طے کیں۔ حضرت کے زمانۂ حیات میں بھی اور بعد ممات بھی حضرت والا کے مکان ہی کے ایک حصہ میں مع بال بچوں کے پڑے کام کرتے رہے، آخری دور تک رہے سہے۔ ادھر ایک سال قبل اشتیاق دیدار شیخ تیز ہوا تو قدرت نے اچانک حضرت والا کے خاص کمرے میں جو خالی پڑا تھا منتقل کر دیا، اور کچھ دنوں قیام رہا، پھر وصی آباد میں حضرت نے آپ کے نام زمین خریدی تھی، آناً فاناً بقدر ضرورت مکان بھی تعمیر ہو گیا، چونکہ حضرت والا کا عطیہ تھا، اس سے بے اعتنائی مناسب نہیں سمجھی گئی، لہٰذا لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ کے حکم کے موافق اس میں قیام کرنے کا

ایک شدید داعیہ پیدا ہوا، اس میں چند روز قیام کیا جو کہ ہر اعتبار سے آخری منزل تھی، سنا ہے آخری ایام میں گاہ بگاہ یہ مصرعہ پڑھتے تھے:

ع شکر نعمتہائے تو چندانکہ نعمتہائے تو

مگر یہاں چند روز کے بعد اشتیاق دیدارِ شیخ اور تیز ہوگیا، اور وفورِ شوق میں کہہ پڑے ے

زینساں کہ عمر می گذرد دَر فراقِ تو   از جانِ خود ملول شدم در گذارِ عمر

بالآخر دو چار روز مرض قے و دست میں مبتلا ہوئے، ایک روز آواز نحیف ہوگئی، دوسرے روز ۱۰؍ رمضان کو بوقت صبح کلمہ طیبہ اور کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا إلیہ راجعون۔

اور بعد تجہیز و تکفین عطرو کافور مل کر کوئے یار کی طرف جنازہ چل دیا، کس شان سے کاندھا بدل بدل کر اور یہ پڑھتے ہوئے ے

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم   راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے   تا درِ میکدہ شاداں و غزلخواں بروم

حضرت والا کے مکان روشن باغ سے آخری سلام کہتے ہوئے حضرت والا کی مسجد میں اترا۔ نمازِ جنازہ عزیزم مولوی عرفان احمد سلّمہٗ نے پڑھائی، اور محلّہ اکبر پور کے قبرستان میں جہاں حضرت والا کی دو صاحبزادیاں مدفون ہیں، وہاں ہی دفن ہوئے۔ اللہ اکبر! کیسی محبت تھی اور کیسی جاذبیت تھی۔

عزیزم! باتیں تو بہت ہیں مگر لکھا نہیں جا رہا ہے، دل قابو میں نہیں ہے، رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ افسوس صد افسوس اب جامؔی صاحب سے ملاقات نہیں ہوگی، بس اب دعائیہ کلمات اور صبر کی تلقین پر خط ختم کرتا ہوں۔ اللہ آپ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اپنی والدہ محترمہ نیز سب بہنوں اور پھوپھیوں سے ہم سب کا سلام مسنون

کہہ دیں، اور یہ کہہ دیں ؎

اے دل بساز باغمِ ہجراں وصبر کن　　اے دیدہ بافراقش ازیں بیش خوں مبار
آرے خیال دوست زپیش نظر مشوی　　چوں بروصال یار نداریم اختیار
حافظؔ تو تا بکے غمِ جانِ پدر خوری　　بسیار غم مخور کہ جہاں نیست پائیدار

والسلام

محمد مبین از آگرہ روڈ، کُرلا، بمبئی

* * * * *

مکتوب تعزیت

شیخ طریقت حضرت مولانا مقتدانا شاہ ابرار الحق صاحب
نور اللہ مرقدہ

عزیزم محی الدین!   سلمک اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارے خط سے تمہارے والد محترم جناب مولانا عبدالرحمٰن صاحب جاؔمی کی رحلت کا علم ہو کر بہت افسوس ہوا، اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرما کر ان کے مدارج کو بلند فرماویں۔

خبر ملتے ہی دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کی سعادت ملی، مدرسہ میں بھی حاضرین نے دعائے مغفرت کی اور ایصال ثواب بھی کیا۔

محض تحصیل ثواب کیلئے تعزیت معروض ہے۔

(۱) إن للہ ما أخذ وللہ ما اعطیٰ وکل عندہ باجل مسمی فلتصبر ولتحتسب۔

(۲) اس قسم کے حادثات کیلئے اکابر کی تعلیمات سے ایک پرچہ شائع کر دیا گیا، اس کی کاپی مرسل ہے، اس کو خود بھی پڑھو اور اہل تعلق اور گھر والوں کو دیدو، انشاء اللہ

تعالیٰ مفید و نافع ہوگا۔

(۳) ایک پرچہ اور بھی ہے، اس کی دفعہ ۱۰ ر بار بار پڑھنا بھی نافع ہے۔

(۴) ''تسهيل الشوق '' کا مطالعہ کرنا اور گھر کے افراد کو سنانا بھی بہت نافع ہے۔ ایک ''طريق الصبر '' کا پرچہ بھی موجود تھا، مرسل ہے۔

(۵) گھر کے افراد کو مضمون واحد۔

تم سب کے لئے دعائے تکمیل مقاصد کرتا ہوں۔

احقر ابرار الحق

◆ ◆ ◆ ◆ ◆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کافیہ حضرت مصلح الامۃؒ کے شارح

مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ

حضرت مولانا مفتی عبدالقدوس صاحب رومیؒ، مفتی شہر آگرہ

اگر علم نحو میں کافیہ ابن حاجب کو کافی کہا جا سکتا ہے تو علم تصوف وسلوک میں سیّدی ومرشدی حضرت مصلح الامۃؒ کی تعلیمات واصلاحات بھی دورِ حاضر میں کافیہ وشافیہ کہی جانے کی مستحق ہیں۔

حضرت مصلح الامۃؒ کی تعلیمات کی اشاعت کا آغاز ماہنامہ ’’الاحسان‘‘ دفتر مکتبہ جامی واخوانہ حسن منزل، الہ آباد سے ہوا تھا جو ۱۹۵۰ء کا قریبی زمانہ تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت مصلح الامۃؒ اپنے وطن مالوف فتحپور تال نرجا میں مقیم اور برادر محترم مولانا جامی صاحبؒ ان کی خدمت میں فروکش تھے۔

حضرت مصلح الامۃؒ جب ترکِ وطن فرما کر الہ آباد تشریف لائے تو حضرت کی تعلیمات کی اشاعت کیلئے پہلے رسالہ ’’معرفت حق‘‘ اور حضرت کی وفات ورِحلت کے بعد دوسرا رسالہ ’’وصیۃ العرفان‘‘ نکلنا شروع ہوا، یہ رسالہ تا حال اشاعت پذیر ہے۔

برادر محترم مولانا جامی صاحب نے حضرت مصلح الامۃؒ کے احوال وسوانح کا ایک بے تکلف وبرجستہ اور دلچسپ سلسلۂ مضمون ’’حالات مصلح الامۃؒ‘‘ کے عنوان سے لکھنا شروع کیا تھا جو تقریباً پندرہ سال کی مدت تک جاری رہا، اس طویل مدت میں بھائی

صاحب مرحوم نے جو کچھ لکھا اس کی مجموعی ضخامت تخمیناً چودہ سو صفحات تک پہونچ گئی۔

بھائی صاحب ہر ماہ حالات مصلح الامۃ سے متعلق صفحات رسالہ سے علیٰحدہ کر کے اپنے پاس جمع کرتے رہے تھے اور جب پورا مضمون مکمل ہوگیا تو اسے جمع کر کے تین جلدوں میں مجلد بھی کرالیا اور خود ہی فہرست مضامین بھی اپنے قلم سے تیار کردی تھی ، یہ کام اس حد تک ہو چکا تھا کہ اُن کا وقت موعود آ گیا اور ۱۰؍ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ مطابق ۲۷؍ مارچ ۱۹۹۱ء کو ان کی وفات ہوگئی۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون

حضرت مصلح الامۃ علیہ الرحمہ کی وفات کے بعد جب لوگوں کو حضرت کے حالات جاننے کی ضرورت محسوس ہوئی تو حضرت کے خویش نمبر ۲ مولانا قمر الزماں صاحب زید مجدہم نے سبقت کی اور ’’تذکرۂ مصلح الامۃ‘‘ کے عنوان سے ایک تذکرہ شائع کردیا، اور کچھ دنوں بعد حضرت کی خانقاہ اور دفتر ماہنامہ وصیۃ العرفان کی جانب سے ایک دوسری سوانح ’’حیات مصلح الامۃ‘‘ مولانا اعجاز احمد اعظمی کے قلم سے نکلی جو حضرت ہی کے مدرسہ وصیۃ العلوم میں مدرس رہ چکے تھے۔

اس پس منظر میں بہ ظاہر یہ امید تو موہوم ہی سی رہ گئی تھی کہ حضرت مصلح الامۃؒ کا وہ مفصل ومبسوط تذکرہ جو حالات مصلح الامۃ کے عنوان سے قسط وار نکلتا رہا ہے وہ اب اشاعت وطباعت کے مراحل سے بھی گزرے گا، لیکن جیسا کہ ہمارا عقیدہ وایمان ہے **كل أمر مرهون باوقاته** ہر کام اپنے مقرر وقت کے ساتھ مقید ہوتا ہے۔

اس معاملہ میں بھی یہی ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے غیب سے صورت اشاعت وطباعت پیدا فرمادی ، اور محترم ومکرم الحاج عبد الوکیل صاحب کاظمی برنا (الہ آباد) (**جزاء الله أحسن الجزاء**) نے لوجہ اللہ تعالیٰ اس کی اشاعت وطباعت کے لئے مکمل تعاون کی پیش کش فرمادی اور اب حالات مصلح الامۃ کا وہ بیش بہا تحفہ طباعت کے لئے دے دیا گیا ہے، محترم جناب کاظمی صاحب کیلئے یہ خدمت مقدر تھی جن کے

دل میں اس کام کا داعیہ محترمی جناب الحاج عاشق حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ مجاز حضرت مصلح الامۃؒ کی برکت سے پیدا ہوا، محترم کاظمی صاحب نے احقر سے فرمائش کی کہ بہتر ہوگا کہ اس مضمون کے ساتھ مرتب مضمون مولانا جامی صاحب علیہ الرحمہ کے کچھ حالات جمع کر دئے جائیں اور مجھے حکم ہوا کہ یہ کام میں انجام دوں، موصوف کا حکم ایسا نہ تھا کہ اسے ٹالا جائے، اس لئے مختصر طور پر کچھ لکھنا منظور کرلیا (ویسے برادر محترم کا مفصل تذکرہ حیات مصلح الامۃ کے مصنف مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی ترتیب دے چکے ہیں) (زیر نظر ایڈیشن اس کی اشاعت دوم ہے)

حالات مرتب ”حالات مصلح الامۃ“:

برادر محترم مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامیؒ کی ولادت ۲۴؍جمادی الاولیٰ ۱۳۳۷ھ مطابق ۲۶؍فروری ۱۹۱۹ء بروز چہارشنبہ کو صبح صادق کے وقت محلّہ قضیانہ قصبہ مچھلی شہر (ضلع جون پور) میں ہوئی۔

جد امجد مرحوم حافظ قاری فضل حق صاحب نے عبدالرحمٰن جامی نام رکھا، ہمارے جد امجد حضرت قاری عبدالرحمٰن صاحب مکی الہ آبادی علیہ الرحمہ کے خصوصی شاگرد تھے۔

بھائی صاحب مجھ سے عمر میں چار سال بڑے تھے۔ میری پیدائش ۲؍شوال ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹؍مئی ۱۹۲۳ء بروز شنبہ بوقت صبح ہوئی۔

۱۹۳۰ء کے قریب کسی زمانے میں والد محترم مولانا محمد سراج الحق صاحبؒ کا تعلق حکیم الامت حضرت تھانوی علیہ الرحمہ سے قائم ہوگیا تھا، اس وقت تک والد صاحب کا ارادہ یہ تھا کہ وہ احقر کو تو حفظ قرآن مجید کے بعد عربی تعلیم دلائیں گے لیکن بھائی صاحب کو وہ انگریزی پڑھانا چاہتے تھے، چنانچہ انھوں نے بھائی صاحب کا نام اسی گورنمنٹ اسکول میں لکھوا دیا تھا جہاں وہ عربی فارسی کے استاد تھے۔

حضرت والد صاحب نے اپنے ایک خط میں حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کو اطلاع دی کہ میرے دو لڑکے ہیں، بڑے کو میں انگریزی پڑھا رہا ہوں اور چھوٹے کو قرآن مجید حفظ کرا رہا ہوں، اسے عربی تعلیم دینے کا ارادہ ہے۔

حضرت کی طرف سے جواب آیا، جواب میں یہ استفسار تھا کہ جس لڑکے کو انگریزی پڑھا رہے ہیں اس کے دین کی حفاظت کا کیا انتظام ہے؟

حضرت علیہ الرحمہ کا جواب آتے ہی والد صاحب نے پہلا کام یہ کیا کہ بھائی کا نام اسکول سے کٹوا دیا، بھائی صاحب اس وقت آٹھویں درجے میں پڑھ رہے تھے، لوگوں نے والد صاحب کو بہت سمجھایا کہ آٹھویں تک تعلیم تو پوری ہو جانے دیجئے، ایک سرٹیفکٹ رہے گا شاید کسی وقت کچھ کام آجائے، مگر والد صاحب نے کسی کی بھی بات نہ سنی اور شیخ کا منشاء سمجھ لینے کے بعد کسی قسم کی حیل وحجت اور قیل وقال کی گنجائش نہ دیکھی۔

برادر محترم مولانا جامی صاحب کی زندگی کا یہ اہم موڑ تھا، جہاں اللہ تعالیٰ نے انھیں صراطِ مستقیم پر لگا دیا، یہ موڑ ان کی سوانح کا ایک جزوِ اعظم ہے جسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اسکول سے علیحدگی کے بعد والد صاحب نے بھائی صاحب کو اور انھیں کے ساتھ احقر کو بھی کچھ دنوں موضع مریاڈیہہ ضلع الٰہ آباد میں محترم حافظ محمد یٰسین صاحب علیہ الرحمہ (مجاز حضرت مولانا سیّد محمد عیسیٰ صاحب الٰہ آبادیؒ) کی خدمت میں رکھا، جہاں احقر تو (حفظ قرآن کے بعد) دور کرتا رہا، اور بھائی صاحب حافظ صاحب سے کچھ فارسی اور اردو کی دینی واصلاحی کتابیں پڑھتے رہے۔

کچھ دنوں بعد مدرسہ اشرفیہ (دائرہ شاہ عبد الجلیل محلّہ چک) الٰہ آباد میں بھائی صاحب نے داخلہ لے لیا، اور عربی کی ابتدائی کتب کافیہ ابن حاجب تک وہیں پڑھیں،

اس کے بعد سہارن پور چلے گئے جہاں شرح جامی وغیرہ کتابوں میں داخلہ ہوا، اگلے سال احقر بھی مظاہر علوم پہونچ گیا۔ ١٣٦٢ھ مطابق ١٩٤٢ء میں بھائی صاحب نے مظاہر علوم سے فراغت حاصل کی، ابھی زیر تعلیم ہی تھے کہ استاذ محترم مولانا عبدالوحید صدیقی مدظلہ صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ فتحپور، سہارن پور تشریف لے آئے، انھیں اپنے مدرسہ کے لئے ایک مدرس کی ضرورت تھی، وہ بھائی صاحب سے ایک درخواست لکھوا کر اپنے ساتھ لیتے گئے، اور فتحپور پہونچ کر اپنے مدرسہ میں بھائی صاحب کا تقرر کرلیا۔ شعبان میں بھائی صاحب سالانہ امتحان سے فارغ ہوئے ہیں اور صرف رمضان شریف کا مہینہ گھر پر گزرا ہے کہ شوال کے مہینے میں مدرسی کے فرائض انجام دینا شروع کردئے، انھیں اپنی ملازمت کے لئے نہ کہیں آنا پڑا نہ جانا پڑا، نہ کہیں انٹرویو کی نوبت آئی۔

١٩٤٧ء کی آزادی کے بعد فتحپور کے مدرسہ میں اچانک حالات نے ایک خطرناک موڑ لیا، جس سے دل برداشتہ ہوکر برادر محترم اور صدیق مکرم مولانا صدیق احمد صاحب باندوی نے مدرسہ سے علیٰحدگی اختیار کرلی، مولانا صدیق احمد صاحب نے تو اپنے وطن ہی میں گھر پر مدرسہ قائم کرلیا جو آج ملک کے مشہور و قابل ذکر مدرسوں میں شمار ہوتا ہے۔

اور برادر محترم نے فتحپور تال نرجا کے کہف میں پناہ لی، بلکہ یوں کہئے کہ ہجرت ہی کر گئے، مگر یہ ہجرت بھی ایک عجیب وغریب قسم کی ثابت ہوئی کہ کچھ دنوں بعد چشم فلک کے ساتھ اہل نظر نے یہ بھی دیکھا کہ الہ آباد کے اس مسترشد کے ساتھ ساتھ حضرت مرشد بھی بہ نفس نفیس الہ آباد کو ہجرت کرکے آگئے۔

اور وہی مولانا جامی جو فتحپور تال نرجا میں حضرت مصلح الامۃ کے زیر سایہ رہتے ہوئے شیخ کے حاضر باش، خادم اور میر منشی و پیشکار بنے ہوئے تھے وہ الہ آباد آنے کے

بعد بھی بالکل اسی طرح حضرت ہی کے جوار وسایہ میں رہے، کسی نے بھی کبھی یہ نہیں دیکھا کہ الہ آباد آنے پر ایک دن بھی مولانا جامی نے اپنے والدین کے ساتھ گزارا ہو۔

حضرت مصلح الامۃ علیہ الرحمہ کی رحلت کے بعد جب فہرست مجازین مرتب ہو رہی تھی اور کچھ لوگ اس فہرست میں اپنے اپنے ناموں کے اندراج کے لئے ہر طرح کوشاں تھے اس وقت برادر محترم اور ہمارے والد بزرگوار حضرت مولانا محمد سراج الحق صاحب علیہما الرحمہ کس طرح دامن کشاں رہے تھے ان حضرات کی سوانح نگاری کے وقت ان کے ایسے احوال پر نظر ڈالنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے۔

فنا اور اس کی قسموں (فناء فی اللہ، فناء فی الرسول، فناء فی الشیخ وغیرہ) کا تذکرہ تو لوگوں نے اکثر سنا ہی ہوگا مگر فناء فی الشیخ کی ایسی مثال شاید لوگوں نے دیکھی ہو، اس موقع پر بھائی صاحب کی وہ بات یاد آ رہی ہے جب ایک موقع پر حضرت قاری صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند کی اس فرمائش پر کہ ”دار العلوم دیوبند کے لئے ایک اچھے معتمد و مستند مفتی کی ضرورت ہے، حضرت کے علم میں کوئی صاحب ہوں تو مرحمت فرماویں“ حضرت مصلح الامۃ نے بھائی صاحب سے فرمایا ”اگر تم جانا چاہو تو تمہارا نام تجویز کردوں“، عین ممکن ہے کہ حضرت مرشد نے اس طرح اپنے مسترشد کا امتحان ہی لیا ہو، اس وقت بھائی صاحب کا جواب صرف یہ تھا کہ میں تو آپ کی خدمت میں رہنے ہی کے لئے آیا ہوں کہیں جانے کے لئے نہیں آیا، وہاں جا کر کیا کروں گا؟

اب ہم آپ خود اندازہ کریں کہ حضرت مصلح الامۃ بھائی صاحب کے اس جواب سے کیسے کچھ مسرور و مطمئن ہوئے ہوں گے۔

اسی طرح حضرت کے رحلت کے بعد حضرت قاری محمد مبین صاحب دامت برکاتہم کو جانشین شیخ کی حیثیت سے بھائی صاحب نے جس بے نفسی اور صدق دلی سے تسلیم کیا اس کی مثال ان کے اقران و امثال میں مشکل ہی سے ملے گی، بھائی صاحب

کی یہ فنائیت وبے نفسی بھی حقیقت یہ ہے کہ خود حضرت مصلح الامۃ کی انتہائی تواضع ومسکنت کا پرتو تھی، جس کا اندازہ اس واقعہ سے بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے، اس واقعہ کا راوی صرف راقم السطور ہی ہے۔

جس سال احقر مدرسہ مظاہر علوم میں دورۂ حدیث میں شریک تھا، اخیر سال ماہ شعبان میں حضرت مصلح الامۃ علیہ الرحمہ نے تھانہ بھون کا سفر فرمایا تھا اور واپسی میں مولانا ظہور الحسن صاحب علیہ الرحمہ کے مکان کتب خانہ امداد الغرباء میں قیام ہوا، اسی موقع پر مدرسہ مظاہر علوم میں ہم لوگوں کا درس بخاری شریف ختم ہو رہا تھا، احقر (چونکہ اس وقت بھی حضرت ہی سے وابستہ تھا) حاضر خدمت ہو کر عرض کیا کہ آج ہمارے ہاں بخاری شریف ختم ہو رہی ہے اگر جناب بھی شرکت فرمالیں تو خوشی ہوگی، حضرت اپنی خمول پسندی کی بنا پر لوگوں سے میل ملاقات کا مزاج ہی نہ رکھتے تھے، اس لئے اہل مدرسہ میں کسی کو خبر بھی نہ تھی کہ مولانا ظہور الحسن صاحب علیہ الرحمہ کے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں، اس لئے ان حضرات کی طرف سے کوئی دعوت بھی نہ تھی، پھر یہ بات بھی تھی کہ اس وقت واقعۂ ختم بخاری تھا، آج کل کی طرح اس کی نمائش اور تشہیر کہاں ہوتی تھی۔

ہم میکدے سے نکلے کہ دنیا بدل گئی

احقر کی درخواست پر حضرت نے بے تامل شرکت پر آمادگی ظاہر فرمادی، مگر دوسرے ہی لمحہ یہ سوال بھی فرمالیا کہ ’’جہاں بیٹھ جاؤں گا وہاں سے اٹھا کر کہیں اور بیٹھنے کو تو نہ کہا جائے گا؟‘‘

احقر نے عرض کیا، یہ کیسے ہوسکے گا، وہ لوگ جناب کی شایان شان جگہ پر ضرور بٹھانا چاہیں گے، یہ سن کر انکار فرمادیا کہ پھر تو میں نہ جاؤں گا۔

حضرت کی اس فنائیت اور تواضع ومسکنت کا پرتو برادر محترم کی زندگی میں نمایاں تھا، جسے ان کی یہ فنائیت نظر نہ آئی ہو اس کا صاحب بصیرت ہونا مشتبہ ہے۔

بھائی صاحب نے ہجری لحاظ سے تقریباً چوہتر سال کی عمر پائی، آخر کے پانچ سات سال معذور کن بیماری میں گزرے، لیکن ان کی خوش مزاجی و بذلہ سنجی ایسی شدید و مدید بیماری میں بھی مطلق بیمار نہ ہوسکی، وہ اسی طرح ہشاش بشاش رہے اور اس کا منشا صرف ان کی خوش مزاجی ہی نہ تھی، بلکہ اس میں خوئے تسلیم و رضا اور جذبہ صبر و شکر کی بھی پوری پوری کارفرمائی تھی، اللہ تعالیٰ انھیں مقام قرب و جوارِ رحمت نصیب فرمائے۔ آمین

عبدالقدوس رومیؔ
مفتی شہر آگرہ

(نوٹ: یہ مضمون ''حالات مصلح الامۃ'' کے لئے لکھا گیا، اور اس میں شائع ہو چکا ہے، دیکھئے: ص: ۱۰ تا ۱۷۔ مفتی صاحب کی فرمائش پر اسے اس کتاب کا جز بنایا جا رہا ہے۔)

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

استاذ گرامی مولانا عبدالرحمٰن جامیؔ

مولانا ظفر احمد صدیقی، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوری قدس سرہ العزیز کے ترجمان وخادم خاص اوران کے مدرسہ وصیۃ العلوم (بخشی بازار، الہ آباد) کے ممتاز استاذ مولانا عبد الرحمٰن جامی، جنھیں ہم سب چھوٹے بڑے جامیؔ صاحب کہا کرتے تھے، نہایت دلکش اور جاذب نظر شخصیت کے مالک تھے۔ دوہرا بدن، صاف ستھرا لباس، کرتے کے اوپر صدری، صدری میں زنجیر سے لگی ہوئی جیبی گھڑی، شگفتہ رو، خندہ جبیں اور ہنس مکھ انسان تھے۔ گفتگو کا انداز نہایت شائستہ ومہذب تھا۔ مزاج میں ظرافت آمیز متانت تھی۔ تحریر وتقریر میں تجنیس، ایہام اور رعایت لفظی کا خاص لحاظ رکھتے تھے، اس سے خود بھی لطف اندوز ہوتے اور دوسروں کو بھی محظوظ کرتے۔

اپنے علم وفضل، تقویٰ وطہارت اور دیگر اوصاف وکمالات پر ہمیشہ پردہ ڈالے رہتے تھے، اس لئے ان کا مخاطب ان کے رتبۂ بلند کا اندازہ نہیں لگا پاتا تھا، وہ صراحتاً تو کجا اشارتاً وکنایتاً بھی خودنمائی وخودستائی کا کوئی جملہ اپنی زبان سے نہیں نکالتے تھے۔ اسی طرح کسی دوسرے کے بارے میں کبھی کوئی ایسی بات نہ کہتے جس میں طنز وتعریض کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔

ناچیز راقم سطور کو جامیؔ صاحب سے تلمذ کا شرف حاصل ہے، ان سے ابتدائی اردو بھی پڑھی ہے اور فارسی بھی، پھر کچھ عربی بھی۔ جب ان کے یہاں فارسی کی پہلی

کتاب شروع ہوئی، تو دو ہی ایک صفحات کے بعد "ہست" کی گردان آ گئی:

ہست، ہستند، ہستی، ہستید، ہستم، ہستیم،

جاؔمی صاحب نے کہا اسے زبانی یاد کر کے آنا، کوشش کی لیکن گردان یاد نہیں ہوئی۔ پھر دوسرے دن بھی یہی ہوا، دو دن کی زبانی تنبیہ کے بعد جب تیسرے دن بھی معاملہ بدستور رہا، تو جاؔمی صاحب کھڑے ہو گئے اور میری پٹائی شروع ہو گئی، کچھ ان کی شخصیت کا رعب اور کچھ مار کا خوف ایسا طاری ہوا کہ میرا پیشاب خطا ہو گیا، لیکن یہ مار ایسی بابرکت تھی کہ بند ذہن کے دریچے وا ہو گئے، اور گردان ایسی ازبر ہو گئی کہ راہ چلتے جس چیز پر نظر پڑتی میں اسے گردانے لگتا، مثلاً بجلی کا کھمبا دیکھ کر شروع ہو جاتا:

بجل، بجلند، بجلی، بجلید، بجلم، بجلیم،

ایک دن شاید آمد نامہ کا سبق ہو رہا تھا۔ مصدر آ گیا، مالیدن، جاؔمی صاحب نے پوچھا "گوش" کے معنی؟ میں نے کہا "کان" پوچھا "مالی" کے معنی؟ عرض کیا، "ملائی" کہا تو "گوش مالی" کے معنی؟ ابھی میں جواب سوچ ہی رہا تھا کہ میرے کانوں کو ملتے ہوئے متبسم انداز میں فرمایا یہ ہے "گوشمالی"۔

ایک دن ہماری جماعت کو مخاطب کر کے سوال کیا، کیا کسی کو اپنی موت کا دن معلوم ہے؟ سب نے کہا نہیں، فرمایا اگر ہر شخص کو پہلے سے معلوم ہو جاتا کہ اسے کب مرنا ہے، تو وہ موت کی پیشگی تیاری کر لیتا، زندگی کی مقررہ مدت کے اندر اپنے سب ضروری کام نمٹا لیتا۔ سب سے مل ملا لیتا، اور دوسرے بھی اس کی رعایت کرتے کہ فلاں کو فلاں دن دنیا سے رخصت ہونا ہے، لاؤ اس کا سب کام کر دیں، اس سے لڑائی جھگڑا نہ کریں، وغیرہ۔ ہم سب بولے ہاں یہ تو بہت اچھا ہوتا، جب سب سے اقرار کرا لیا تو فرمایا نہیں بھائی، اس میں اللہ کی بڑی مصلحت ہے، اگر موت کا دن مخفی نہ ہوتا تو انسان جیتے جی مر جاتا۔ دنیا کے کسی کام میں اس کا دل ہی نہ لگتا، ہر وقت موت کے تصور میں

ڈوبا رہتا۔ اس طرح دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہوجاتا۔ اللہ تعالیٰ نے بڑا کرم فرمایا کہ کسی انسان کو یہ نہیں بتلایا کہ اسے کب مرنا ہے؟ اس طرح سب اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں، اور وقت آنے پر دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں۔ یہ تھا جامی صاحب کا اندازِ تفہیم و تدریس!

حضرت والاؒ کی خانقاہ کے سامنے جامی صاحب کی کتابوں کی ایک دوکان تھی، غالباً مکتبہ اشرفیہ اس کا نام تھا۔ میں وہاں بیٹھا ہوا تھا، ایک صاحب نے بیان القرآن کے کچھ اجزاء خریدے، باوضو نہ تھے، اس لئے ہاتھ میں تھامنے کے بجائے اسے دامن میں لے لیا۔ جامی صاحب نے فرمایا اسے بے وضو چھونا بھی جائز ہے، اور اگر باوضو چھونے کا اہتمام کریں تو نورٌ علیٰ نور ہے، لیکن اگر کپڑے سے چھونا ہو تو اس کپڑے کو جسم سے علیحدہ ہونا چاہئے، دامن میں رکھ لینے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ میرے بچپن کا زمانہ تھا اور میں اس گفتگو کا براہ راست مخاطب بھی نہیں تھا، لیکن جامی صاحب کا اندازِ گفتگو اس قدر شائستہ اور مشفقانہ تھا کہ پوری بات آج تک یاد رہ گئی۔

ایک دن ہماری جماعت کا کوئی سبق ان کے ہاں ہو رہا تھا کہ ذوق کا شعر درمیان میں آگیا۔

نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا بڑے موذی کو مارا نفس امّارہ کو گر مارا

اتفاق ایسا ہوا کہ ٹھیک اسی وقت جامی صاحب کے برادر خورد حافظ عبدالعزیز سعدی صاحب برابر والے کمرے میں تشریف لائے، وہ شکار کے شوقین تھے۔ جامی صاحب نے انھیں مخاطب کر کے کہا، دیکھو سعدی! یہ شعر تمہارے لئے ہے۔ سعدی صاحب خود بھی شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے، اس لئے محظوظ ہوئے، خود ان کے صاحب ذوق ہونے کا اندازہ اس طرح ہوا کہ ایک دن پان کھا رہے تھے، چونے سے زبان کٹ گئی، اس مناسبت سے انھوں نے غالب کا شعر پڑھا۔

بات پر واں زبان کٹتی ہے وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

شاید یہ قصہ جامؔی صاحب کی درسگاہ میں ہی پیش آیا۔

جامؔی صاحب ہم طلبہ کو حضرت والاؒ کے مدرسے کے دوسرے اساتذہ سے الگ اور بھلے معلوم ہوتے تھے، ایک تو اس لئے کہ ان کا اندازِ نشست و برخاست اور طرزِ گفتگو دوسروں سے مختلف تھا، دوسرے ان کے یہاں ہر چیز میں حسن ترتیب و تنظیم کی جھلک نظر آتی تھی۔ ان کے سامنے ایک ڈیسک رکھی ہوتی تھی، اس پر ضروری کاغذات کے علاوہ دو ایک پیپر ویٹ ہوتے، پنسل اور قلم وغیرہ علٰیحدہ رکھے ہوتے، ردّی کاغذات برابر ٹکڑوں میں کٹے ہوئے کلپ سے دبا کر اپنی جگہ پر ہوتے، ان سب پر مستزاد ان کی بذلہ سنجی و خوش طبعی تھی۔

ایک دن عم محترم مولانا عمار احمد صاحب کے خسر مکرم مولوی امجد اللہ صاحب، رئیس گورکھپور، الہ آباد تشریف لائے۔ ان کے لئے چائے کا اہتمام کیا گیا تھا، دسترخوان بچھایا گیا، گرین لیبل چائے دم کی ہوئی ٹکوزی سے ڈھانک کر رکھی گئی، ایک جانب مہمان بیٹھے، ایک طرف جامؔی صاحب اور ایک دو لوگ بیٹھے۔ چچا کے برابر میں مَیں بھی بیٹھ گیا، مہمان نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے استفہامیہ لہجہ میں کہا ’’یہاں لڑکے بھی چائے پیتے ہیں؟‘‘ جامؔی صاحب نے برجستہ فرمایا: ’’جی ہاں لڑ، کے پیتے ہیں‘‘۔

ایک مرتبہ کلہاپور (ندوہ سرائے) کے داروغہ مشتاق خاں صاحب کے چھوٹے بھائی، جامؔی صاحب کی درسگاہ میں ان کے پاس آ کر بیٹھے، وہ پولیس کے محکمے میں ملازم تھے، ان کا افسر ایک متعصب شخص تھا، انھیں طرح طرح سے تنگ کرتا رہتا تھا۔ ایک دن اس نے ان کی داڑھی کا بھی مذاق اڑایا، پٹھان آدمی تھے، برداشت نہ کر سکے، انھوں نے کمرے کا دروازہ بند کر کے اس کو مارنا شروع کیا، اس نے دھمکاتے ہوئے کہا: میرا بھائی ایم۔ ایل۔ اے ہے۔ لیکن وہ کہاں رکنے والے تھے، سلسلۂ ضرب جاری رکھا۔ یہ تمام روداد جامؔی صاحب کو سنا رہے تھے، جب آخری فقرے پر پہونچے تو جامؔی صاحب نے

فرمایا: آپ نے یہ کہا کہ پہلے امّیں لے (یعنی اس میں لے) پھر ایم۔ ایل۔ اے۔

ایک دن بعد عصر ہم تین چار کم عمر طلبہ جامؔی صاحب کی درسگاہ کے باہر حضرت والاؒ کے مکان کے صدر دروازے پر کھڑے ہوئے تھے، اتنے میں کوئی راہ گیر ادھر آیا، اور اس نے پوچھا کہ ایک عورت کہتی ہے کہ اس کے شوہر نے اسے طلاق دیدی ہے، لیکن شوہر انکار کرتا ہے، تو طلاق ہوئی کہ نہیں؟ میں نے جلدی سے بڑھ کر جواب دیا کہ جب شوہر انکار کر رہا ہے تو طلاق کیسے ہوجائے گی؟ وہ آدمی آگے بڑھ گیا، جب تک جامؔی صاحب آگئے، انھوں نے دور سے اسے جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا، پوچھا وہ کون آدمی تھا؟ کس لئے آیا تھا؟ ساتھی طلبہ نے اس کا سوال اور میرا جواب دہرادیا، جامؔی صاحب نے دو تین زوردار چپت مجھے رسید کئے اور فرمایا: اپنے بڑے کے پاس بھیجنے کے بجائے خود ہی مفتی بن گئے۔ اللہ استاذ کی قبر کو نور سے بھردے، انھوں نے ایسا سبق دیا جو اس دن سے آج تک کبھی نہیں بھولا۔ اب ایسے ہر موقع پر ان کی ہدایت پر عمل کی توفیق نصیب ہوتی ہے۔

زمانۂ طالب علمی کے برسہابرس بعد ایک بار جامؔی صاحب کی خدمت میں حاضری کا اتفاق ہوا، ان کا قیام حضرت والا کے مکان کی اوپری منزل کے اس کمرے میں تھا جس میں کبھی حضرتؒ خود رہا کرتے تھے۔ یہ ان کی بیماری اور معذوری کا دور تھا، کمزور ہوگئے تھے، لیٹے ہوئے تھے، شاید پیر کی انگلیوں میں زخم تھا۔ میں نے عرض کیا: والد مرحوم کا فتح پور تال نرجا میں کچھ دنوں آپ کا ساتھ رہا ہے، اس کے علاوہ بھی وقتاً فوقتاً ملاقاتیں رہی ہیں، ان سے متعلق کچھ لکھ دیجئے، از بسکہ تواضع وانکسار طبیعت ثانیہ بن چکا تھا، کہنے لگے: مجھے لکھنا لکھانا کہاں آتا ہے؟ رومؔی سے کہو، وہ صاحب قلم ہیں، کچھ لکھ دیں گے۔

آپ کی تصانیف میں ''حالات مصلح الامت'' ایسی عمدہ اور دلکش کتاب ہے، کہ جب اٹھا لیجئے، پڑھتے چلے جایئے، سیری نہیں ہوتی۔ بارہا ایسا ہوا کہ مطالعے کے

دوران رات کے دو ڈھائی بج گئے اور خبر بھی نہ ہوئی، کیوں نہ ہو؟ حالات، مصلح الامت کے ہیں اور قلم ترجمانِ مصلح الامت کا، اخلاص میں ڈوبا ہوا، تصنع اور آورد سے پاک، حسن کلام کا آئینہ، اپنی مثال آپ۔ ع

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

جامیؔ صاحب کو عربی فارسی سے اردو ترجمے میں ید طولیٰ حاصل تھا، ان کا ترجمہ اصل سے قریب رہتے ہوئے بھی سلیس اور بامحاورہ ہوتا ہے۔ متعدد مستقل کتابوں کے علاوہ صدہا فارسی و عربی کے اشعار کے اردو ترجمے بھی ان کی یادگار ہیں۔

جامیؔ صاحب کی سیرت و اخلاق کا یہ پہلو بھی لائقِ ذکر ہے کہ انھوں نے مدت العمر قدرِ کفاف پر گزر بسر کی اور قناعت و توکل کو ہمیشہ شعار بنائے رکھا۔ مزید برآں حضرت مصلح الامتؒ سے اپنے تعلق و نسبت کو کبھی عزت و شہرت، جاہ و منصب اور آسائش دُنیوی کے حصول کا ذریعہ نہیں بنایا، جبکہ حضرتؒ کے دوسرے بہت سے متعلقین و متوسلین کے قدم اس راہ میں ڈگمگا گئے۔ وہ صحیح معنوں میں عرفیؔ کے اس شعر کا مصداق تھے ؎

از باغِ جہاں رَخت بہ بستیم و گذشتیم
شاخے زِ درختے نہ شکستیم و گذشتیم

جامیؔ صاحب کے فرزند ارجمند مولوی محی الدین صاحب جوان صالح کی مثال ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی عمر اور علم و عمل میں برکت عطا فرمائے۔ انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ ”ذکر جامی“ کی اشاعت ثانی کے تعلق سے کچھ عرض کروں، تعمیلِ ارشاد میں ٹوٹی پھوٹی چند سطریں حاضر ہیں۔ ساتھ ہی یہ احساس بھی دامن گیر ہے کہ:

ع حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ظفر احمد
۶/۱۵/۲۰۰۷ء

* * *

مولانا عبدالرحمٰن جامیؔ علیہ الرحمہ

حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی علیہ الرحمہ

رمضان المبارک کا آخری عشرہ شروع ہو چکا تھا کہ مفتی آگرہ مولانا عبدالقدوس رومیؔ زید مجدہم کا ۱۶؍رمضان المبارک کا لکھا ہوا مکتوب ملا جس میں سلام مسنون کے بعد اس عاجز کو اطلاع دیتے ہوئے لکھا گیا تھا کہ کل دوپہر کو بذریعہ ڈاک یہ اطلاع اچانک ملی کہ برادر محترم مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ جو کئی سال سے معذور زندگی گزار رہے تھے چار روزے رکھنے کے بعد اچانک ان کی طبیعت بگڑ گئی، کوئی علاج کارگر نہ ہو سکا اور ۱۰؍رمضان (۲۷؍مارچ) کو بعد فجر سوا چھ بجے انتقال فرما گئے۔ اِنا للہ و اِنا اِلیہ راجعون

دل میں تقاضہ ہوا کہ ان مرحوم ومغفور مولانا عبدالرحمٰن جامی صاحب کا ناظرین کرام سے کچھ تعارف کرادیا جائے۔ یہ فرزند اکبر تھے اس عاجز کے ایک ہم مشرب ومسلک اور قدیم دوست مولانا سراج الحق مچھلی شہری کے جو حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے مسترشدین میں تھے، پھر حضرت کی وفات کے بعد آپ ہی کے جلیل القدر خلیفہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری ثم الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی تجدید کے ساتھ اصلاحی تعلق قائم کیا، اس عاجز نے الہ آباد کی اس وصی اللّٰہی خانقاہ میں بارہا دیکھا کہ مجلس ارشاد کے حاضرین میں حضرت کی خاص نظر عنایت اور توجہ سب سے زیادہ حضرت مولانا سراج الحق صاحب کے حصہ میں آتی تھی، ان کے یہ خوش نصیب فرزند مولانا عبدالرحمٰن جامی اس سعادت کے پورے

وارث ہوئے، جس زمانہ میں حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قیام اپنے وطن ضلع اعظم گڈھ کے ایک دیہات فتحپور تال نرجا ہی میں تھا، یہ مولانا جامی صاحب وہیں جا پڑے اور جلد ہی حضرت کے خادم خاص اور معتمد کا مقام حاصل کرلیا، پھر حضرت کی وفات تک ہر طرف سے یکسو اور ہر شغل سے بے تعلق ہو کر حضرت کی خدمت وصحبت کے ذریعہ استفادہ ہی کو اپنی زندگی کا واحد مقصد بنالیا، پھر حضرت کی وفات کے بعد بھی خانقاہ سے اسی طرح متعلق رہے جس طرح حضرت کی حیات میں رہتے تھے، اور حضرت کے سوانح حیات، ملفوظات اور اصلاحی مکتوبات وغیرہ افادات کو خانقاہ سے شائع ہونیوالے ماہنامہ ’’وصیۃ العرفان‘‘ کے لئے ترتیب کا کام جب تک کام کرنے کے لائق رہے جہاں تک معلوم ہے زیادہ تر یہ مولانا جامی صاحب مرحوم ہی انجام دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور ہمارے ان کے ساتھ رحمت ومغفرت کا معاملہ فرمائے۔

(ماہنامہ الفرقان لکھنؤ، ستمبر ۱۹۹۱ء/صفر المظفر ۱۴۱۲ھ)

* * * * *

ضمیـــمہ

ضمیمہ (۱)

اخلاص کی تعریف

جامی صاحب لکھتے ہیں:

”ہمارے ایک دوست ہیں چودھری حبیب الرحمٰن صاحب جو کہ مضافات الہ آباد کے ایک قریبی گاؤں بمرولی کے رہنے والے ہیں، حضرت والا کبھی کبھی جب شہر کی فضا سے گھبراتے تو ان ہی کے دیہات میں چلے جاتے۔ ایک دفعہ بعض حالات کی وجہ سے حضرت والا بچوں کے ہمراہ وہاں تشریف لے گئے اور دو تین ماہ قیام فرمایا، اس درمیان میں جو مہمان الہ آباد آتے تھے وہ بھی وہیں چلے جاتے تھے، مثل مشہور ہے کہ صدر ہر جا کہ نشیند صدر است، حضرت والا بھی جس جنگل میں قیام فرماتے تھے اس میں منگل ہو جاتا تھا، چنانچہ یہاں بھی حضرت والا کے طول قیام کی وجہ سے مہمانوں کی آمد ورفت کثرت سے ہونے لگی، حتیٰ کہ ان کے کھانے پینے کے ہوٹل وغیرہ بھی قائم ہو گئے، انھیں دنوں مئو سے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہٗ بھی تشریف لائے، غالباً تین روز قیام فرمایا، ان کے لئے چودھری صاحب نے علیٰحدہ کمرے میں ٹھہرنے کا انتظام کیا۔

خود چودھری صاحب بیان فرماتے تھے کہ ایک دن میں حضرت والا کی

خدمت میں حاضر تھا، حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ چودھری صاحب آپ کے ہم نام ایک مولانا صاحب اعظم گڈھ سے تشریف لائے ہیں، آپ ان کو پہچانتے ہیں؟ چودھری صاحب نے عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا ان کے پاس جایئے اور میری طرف سے ان سے دریافت کیجئے کہ ''اخلاص کسے کہتے ہیں؟'' چودھری صاحب کہتے ہیں کہ میں گیا تو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے سلام کیا اور قریب جا کر بیٹھ گیا، اور عرض کیا کہ حضرت والا نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے اور فرمایا ہے کہ ''اخلاص کسے کہتے ہیں؟''۔ میرے منہ سے حضرت کا سوال سننا تھا کہ مولانا لیٹے تھے اٹھ کر بیٹھ گئے اور دونوں ہاتھ سے اپنا سر پکڑ لیا اور ایک دو منٹ تک سر جھکائے کچھ سوچتے رہے۔

راقم عرض کرتا ہے کہ ناظرین کرام حضرت مصلح الامت رحؒ کی عظمت شان اور شان اصلاح کا یہ منظر دیکھیں کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب جیسی عظیم المرتبت شخصیت جو کہ اس وقت استاذ العلماء کے منصب پر فائز تھی، اور فن حدیث میں تو اپنی خداداد حذاقت و لیاقت اور اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے عجب نہیں کہ ہند میں فوق الکل ہونے کا مقام آپ کو حاصل ہو، وہ بھی طریق باطن میں آ کر اس سے متعلق شیخ وقت کے ایک سوال کو کس قدر عظمت اور تأدب کے ساتھ سن رہے ہیں، پھر اس کا جو جواب دیا ہے حق یہ ہے کہ وہ مولانا ہی کا حق تھا ؎

قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

اصل یہ ہے کہ مولانا پر اس سوال کا منشا مکشوف ہوا، اور اس سے مولانا نے سمجھا کہ حضرت والا اس کے ذریعے کوئی اہم علم عطا فرمانا چاہتے ہیں اور کسی خاص چیز کی طرف متوجہ فرمانا چاہتے ہیں، ورنہ تو اخلاص کے لفظی معنیٰ کون نہیں جانتا۔ اس لئے قدرے تامل کے بعد سر اٹھا کر فرمایا کہ حضرت سے جا کر عرض کر دیجئے کہ:

”اخلاص اس کو کہتے ہیں کہ آدمی جس کا ہو جائے بس اسی کا ہو رہے۔“

چودھری صاحب کہتے تھے کہ میں نے حضرت والا سے جا کر مولانا کا یہ جواب نقل کر دیا۔ حضرت جواب سن کر مسکرائے۔ جس سے میں نے اندازہ کرلیا کہ حضرت نے بھی اس جواب کو پسند فرمایا۔ (معرفت حق: ماہ اپریل ۱۹۷۵ء)

* * *

ضمیمہ (۲)

دولت خانہ اور غریب خانہ

مولانا جامی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

”ہمارے حضرت کے ایک خادم ہیں شبلی موذن، مئو کے رہنے والے، وہ بیان کرتے تھے کہ میں ایک مرتبہ فتح پور حاضر ہوا، ان ہی دنوں صوفی عبدالرب صاحب (اناؤ کے رہنے والے بزرگ اور نہایت قادر الکلام و پُر گو شاعر) بھی آئے ہوئے تھے، میری ان کی شناسائی نہ تھی، وہ نل پر پانی لینے آئے، میں نے ان کے ہاتھ سے لوٹا لے کر پانی بھر کر ان کو دے دیا، فرمایا جزاکم اللہ۔ میں نے ان سے پوچھ لیا کہ جناب کا دولت خانہ کہاں ہے؟ فرمایا کہ میں اناؤ سے حاضر ہوا ہوں، اس کے بعد میں نے کہا کہ اب یہی سوال آپ مجھ سے فرمایئے، میرے اس کہنے پر وہ ذرا چونکے مگر مسکرا کر مجھ سے فرمایا کہ اچھی بات ہے صاحب! بتایئے آپ کا دولت خانہ کہاں ہے؟ شبلی صاحب کہتے تھے کہ میں نے اس کے جواب میں عرض کیا کہ دولت خانہ تو میرا یہی فتح پور ہے البتہ غریب خانہ اس خادم کا مئو ہے۔ صوفی صاحب ماشاء اللہ اہل دل بھی تھے اور شاعر زندہ دل بھی، ان کے اس جواب پر انھیں وجد ہی تو آ گیا، فرمایا سبحان اللہ، سبحان اللہ، واہ وا، آپ نے کیا خوب جواب دیا، ماشاء اللہ۔ کہتے تھے کہ اس ملاقات کے بعد ان

سے قدرے بے تکلفی ہوگئی، پھر جس دن صوفی صاحب واپس جانے لگے اسی دن مجھے بھی مئو جانا تھا، حضرت والا نے فرمایا کہ شبلی! دیکھو صوفی صاحب جارہے ہیں ان کو کُھرہٹ اسٹیشن پر ریل میں سوار کرکے تب تم مئو جانا، میں نے عرض کیا حضرت بہت اچھا، خانقاہ سے ہم لوگ روانہ ہوئے تو میں نے صوفی صاحب سے عرض کیا حضرت امیر سفر کون ہوگا؟ یہ سن کر مسکرائے اور فرمایا کہ آپ اور کون؟ میں نے کہا بہت اچھا، اس کے بعد میں نے یہ کیا کہ اپنی چادر پھیلا کر اپنا سب سامان اور جناب صوفی صاحب کا سب سامان رکھ کر ایک بڑا سا گٹھر بنا کر سر پر لے کر چلا، صوفی صاحب نے فرمایا ارے موذن صاحب یہ کیا کررہے ہیں، لایئے کچھ سامان مجھے بھی تو دیدیجئے، میں نے کہا حضرت میں امیر ہوں، آپ کو میرے انتظام میں اب مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے، اس پر صوفی صاحب کو خاموش ہوجانا پڑا۔

یہ شبلی بھائی پڑھے لکھے آدمی نہیں تھے، مگر حضرت مصلح الامتؒ کی صحبت اور تعلق کی وجہ سے ماشاء اللہ فہم اور معلومات اتنی وسیع رکھتے تھے کہ ہم جیسے پڑھے لکھے ان سے سبق پڑھیں، کہتے تھے کہ پھر راستے بھر صوفی صاحب سے خوب خوب باتیں رہیں۔

بیان کرتے تھے کہ میں ان سے بے تکلف تو ہو ہی گیا تھا، اور یہ بھی دیکھا کہ میری باتوں کو توجہ کے ساتھ سنتے ہیں تو میں نے ایک موقع پر ان سے عرض کیا کہ حضرت اگر کوئی شخص کسی بزرگ سے فیض حاصل کرنا چاہتا ہے تو بھائی بن کر نہیں اولاد ہوکر دیکھے، اس پر صوفی صاحب اس وقت تو کچھ نہیں بولے لیکن بعد کو جب حضرت سے تعلق قائم فرمالیا اور دوبارہ ان کی ملاقات ہوئی تو مجھے دعائیں دیں، اور فرمایا اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے، آپ نے تو میرا راستہ ہی کھول دیا۔

(معرفت حق: ماہ اپریل ۱۹۷۵ء)

◆ ◆ ◆ ◆ ◆

ضمیمہ (۳)

حضرت مولانا شاہ محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادی

وفات: ۱۱؍مارچ ۱۹۴۴ء

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی درس گاہِ تربیت و ارشاد سے جو ذرے ماہِ تاباں بن کر چمکے اور جن کی روشنی نمایاں طور پر محسوس کی گئی ان میں ایک روشن تر نام حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادیؒ کا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

> سلوک و طریقت، مسلک و مشرب، صورت و سیرت حتیٰ کہ نشست و برخاست اور خط و کتابت اور گفتگو میں اپنے مرشد کامل سے اس درجہ مشابہت حاصل کر لی تھی کہ ان کو دیکھ کر کہنا پڑتا تھا، ع
>
> تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری
>
> (یعنی اس کے بعد کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ میں اور تم الگ الگ ہیں)

مولانا کا وطن ضلع الہ آباد میں ایک گاؤں محی الدین پور تھا، نسباً سادات کرام میں سے تھے، گھر کے خوشحال زمیندار تھے، مولانا کی ولادت ۱۳۰۰ھ میں ہوئی، طبیعت میں دینداری ابتدا ہی سے تھی، والد صاحب نے انگریزی تعلیم میں لگایا لیکن دینی کتابیں بھی مطالعہ میں رہا کرتی تھیں، بالخصوص حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے مواعظ جن کا اس دور میں خاص شہرہ تھا اور شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہو رہے تھے، ان کا

مطالعہ بہت شوق سے کرتے تھے اور اس کی وجہ سے حضرت تھانویؒ سے غایت درجہ عقیدت تھی، ۱۹۰۲ء میں جب وہ بی۔ اے میں زیرِ تعلیم تھے تو حسن اتفاق سے حضرت حکیم الامت کی تشریف آوری الہ آباد میں ہوئی، ریلوے اسٹیشن کے قریب شیخ عبداللہ کی مسجد میں مقیم ہوئے اور جا بجا شہر میں وعظ ہوتے رہے۔ ''خواندہ'' اور ''شنیدہ'' جب ''دیدہ'' بنا تو دل کا عالم کچھ اور ہی ہو گیا۔ اب وہ تھے کہ دل محبت الٰہی، عشق نبوی اور عظمت شریعت کا روشن چراغ تھا اور واسطہ چونکہ حضرت تھانویؒ تھے اسلئے ان کے ساتھ والہانہ وارفتگی تھے، دنیاوی تعلیم فراموشی کی نذر ہونے لگی، بی۔ اے کی انگریزی خوانی تسبیح وتہلیل کی زمزمہ خوانی سے بدلنے لگی، دنیاوی مناصب ومراتب کی ہوس نکل گئی اور قرب خداوندی کی تڑپ پیدا ہوگئی۔ بی۔ اے کا امتحان دیا اور ناکام ہو گئے۔ کتنی خوش کام تھی یہ ناکامی کہ اس نے آخرت کی کامیابی کا دروازہ کھول دیا، اب انگریزی پڑھنے کے ارادہ ہی سے ہاتھ اٹھالیا، البتہ ٹریننگ حاصل کرلی اور فتحپور ہسوہ میں ضلع اسکول کی ماسٹری مل گئی۔ تھانہ بھون حاضر ہو کر حضرت تھانویؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت ہو گئے۔ فتحپور میں طبیعت کا رجحان ہوا کہ دینی علوم کی تکمیل کرلینی چاہئے، اس وقت مدرسہ اسلامیہ میں ایک متبحر عالم مولانا نور محمد صاحب تھے جو عالم فاضل ہونے کے ساتھ ایک صاحب نسبت بزرگ بھی تھے، ان سے درخواست کی مولانا نے پڑھانا منظور کرلیا، اسکول کی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر ساڑھے چار بجے شام کو مولانا کے درس میں شرکت کرتے، اس طرح حضرت مولانا نے فقہ، حدیث اور تفسیر کا باقاعدہ درس لیا۔ مولانا سراج الحق صاحب مچھلی شہری علیہ الرحمہ لکھتے ہیں کہ:

> ''حضرت کے ایک ہم سبق مولوی صاحب فتحپوری ناقل تھے کہ مولانا محمد عیسیٰ صاحب کا ریاض اتنا بڑھا ہوا تھا کہ جب حضرت استاذ کچھ تقریر فرمانے لگتے تو ہم پاس بیٹھنے والوں کو صاف محسوس اور مسموع ہوتا تھا کہ مولانا عیسیٰ صاحب کا

قلب ذکر کر رہا ہے"۔

فتحپور سے حضرت مولانا کا تبادلہ لکھنؤ ہوگیا، وہاں سے حضرت مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلّی کے ہمراہ اپنے والد کو لے کر حج پر تشریف لے گئے۔ لکھنؤ سے مرزاپور، الہ آباد، فیض آباد تبادلہ ہوتا رہا۔ فیض آباد میں ۴۵ ؍سال کی عمر میں حفظ قرآن کا داعیہ پیدا ہوا، چنانچہ کچھ مدت میں یہ دولت بھی حاصل کرلی۔ ۱۹۲۳ء میں الہ آباد تبادلہ ہوا اور یہاں ۱۹۳۷ء میں پنشن لے کر سرکاری ملازمت سے یکسوئی حاصل کرلی اور مرشد کے حکم سے اپنے وطن میں مقیم ہوکر طالبین کی تعلیم وتربیت میں مشغول ہوگئے۔

حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب حضرت مولانا تھانویؒ کے اخص الخواص خلفاء میں تھے، حضرت نے خلفاء کی جو فہرست شائع کی تھی، اس میں سب سے پہلا نام انھیں کا ہے۔ زہد وتقویٰ میں آپ کا خاص مقام تھا۔ حضرت حکیم الامتؒ نے سب سے زیادہ طالبین تربیت کے لئے آپ ہی کے سپرد کئے تھے۔

علامہ سید سلیمان صاحب ندوی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

> "اللہ کی شانِ بندہ نوازی نظر آتی ہے کہ انڈر گریجویٹ مین جس نے صرف انگریزی ہی کی تعلیم پائی تھی، چندروز میں یہ انقلاب پیدا ہوا کہ اس نے اس عمر میں آکر سرکاری ملازمت کے ساتھ عربی کی تعلیم پوری کی اور قرآن وحدیث کا علم حاصل کیا اور ساتھ ہی قرآن پاک حفظ کیا اور سیرت وصورت میں یہ رنگ پیدا کیا کہ کوئی دیکھ کر یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ انگریزی کا ایک لفظ بھی جانتا ہے۔ وہ نہایت عابد وزاہد اور مرشد کے اصولوں کے سختی سے پابند تھے"۔

حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب کے خاص مسترشد جو بعد میں حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے مجازِ بیعت ہوئے، حضرت مولانا قاری حبیب احمد صاحب مدظلۂ ارشاد فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت مولانا کہیں تشریف لے جارہے تھے کئی لوگ

ساتھ میں تھے، میں نے کسی موقع پر عرض کیا کہ حضرت جب گفتگو کرتے ہیں، جب چلتے ہیں یا اور بھی کوئی کام کرتے ہیں تو بے ساختہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ یاد آجاتے ہیں، حضرت کا ہر کام حضرت تھانویؒ کے بالکل مشابہ ہے۔ قاری صاحب فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ عرض کیا اور حضرت تھانویؒ کا نام ان کے کان میں پڑا تو وہیں رُک گئے اور ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھے اور میری طرف رخ کرکے فرمایا:

> ”جی ہاں! ابتداءً میں نے بہ تکلف حضرتؒ کی نقل کی پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے اسی رنگ میں ڈھال دیا“

قاری صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت تھانویؒ جاڑوں میں اونی کپڑے استعمال کرتے تھے اور سر پر دوہرا رومال عمامہ کے مثل باندھ لیا کرتے تھے، حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب بھی ہمیشہ جاڑوں میں اسی طرح کا اونی لباس استعمال کرتے اور سر پر دوہرا رومال باندھا کرتے، ایک سال دیکھا کہ روئی دار لباس پہنے ہوئے ہیں ہم لوگوں کو تعجب ہوا تو معلوم ہوا کہ حضرت تھانویؒ نے بھی روئی دار لباس استعمال فرمایا ہے، اونی کپڑوں کو کیڑے لگ گئے تھے، حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ ان کپڑوں کی حفاظت ایک مستقل مشغلہ ہے اب روئی دار کپڑے بنوادئے جائیں۔ اُدھر ان کے بدن پر روئی دار کپڑا آیا اور اِدھر حضرت مولانا نے بھی استعمال کرنا شروع کردیا۔

حضرت مولانا کو ذکر و عبادت، اتباعِ سنت، نماز باجماعت کا خاص اہتمام تھا، آپ کی مجالس اسی ذکر و تذکرے سے ہمیشہ معمور رہا کرتی تھیں۔ میں نے براہ راست حضرت مولانا قاری حبیب احمد صاحب کی زبانی سنا کہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ نے ایک بار حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے ایک مرتبہ چاہا کہ تہجد و عبادت میں ان سے سبقت لے جاؤں، خانقاہ میں بہت سویرے اٹھا تو دیکھا کہ حضرت مولانا تہجد میں مصروف قرأت ہیں اور دوسرے دن اور

سویرے اٹھا تو آج بھی دیکھا کہ مولانا پہلے سے نیت باندھے ہوئے ہیں، میں نے خیال کیا کہ ان سے بازی لے جانا مشکل ہے۔

فرمایا کہ مولانا کو ذکر میں بڑی محویت ہوتی تھی، ایک بار ذکر کرتے ہوئے خانقاہ کی طرف آرہے تھے، ذکر کی محویت میں انھیں کچھ خیال نہیں رہا خانقاہ کے پھاٹک سے آگے بڑھ گئے میں پیچھے پیچھے تھا، میں نے جا کر عرض کیا تو فرمایا **جزاك الله** مجھے یاد ہی نہیں رہا۔

حضرت مولانا قاری حبیب احمد صاحب مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ حضرت مولانا الہ آباد پنشن لینے آتے تو ایک خاص جگہ ٹھہرا کرتے اور قاری صاحب کو اپنی آمد کی اطلاع کرتے، یہ ان کی خدمت میں پہونچ جاتے، مولانا خیریت دریافت کرنے کے بعد پہلا سوال یہ کرتے کہ نمازوں کی جماعت کے اوقات کیا کیا ہیں؟ پھر ہر نماز سے پانچ دس منٹ پہلے مسجد میں آجاتے حالانکہ قاری صاحب کی مسجد آپ کی قیام گاہ سے سے کافی فاصلہ پر تھی، مگر اہتمام سے ہر نماز سے پہلے مسجد میں آپہونچتے، جماعت کی نماز سے حضرت مولانا کو عشق تھا، آپ کی ہر مجلس میں نماز کی تاکید کا ذکر ضرور آتا۔

سید صاحب علیہ الرحمہ لکھتے ہیں کہ:

> ’’اپنے مرشد کی متعدد کتابوں کے خلاصے اور شروح شائع کئے، جن میں سب سے اہم ’’انفاسِ عیسیٰ‘‘ ہے جو سلوک اشرفی کی معتبر ترین کتابوں میں ہے۔ مردوں کے لئے ’’بہشتی زیور‘‘ کا خلاصہ ’’بہشتی ثمر‘‘ کے نام سے کیا جو مکاتب میں رائج ہوئی، تفسیر ’’بیان القرآن‘‘ کا خلاصہ مترجم قرآن کے حواشی کے طور پر کیا جو الہ آباد میں زیرِ طبع تھا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ’’کمالاتِ امدادیہ‘‘ کے طرز پر انھوں نے ’’کمالاتِ اشرفیہ‘‘ لکھی جو فن سلوک و معرفت کے متعلق ان کی استعداد و صلاحیت کی آئینہ دار ہے۔ حدیث میں ’’ازالۃ الوسن بالف

> من السنن ''اردو ترجمہ کے ساتھ ان کی مفید تالیف ہے۔ زہد وورع، اخلاق اور سلوک کی ایک ہزار حدیثیں جمع کی ہیں''

مولانا جامیؔ صاحب کے بھتیجے مفتی مجد القدوس سلّمہٗ خبر دیتے ہیں کہ آخری کتاب کا ایڈیشن پاکستان میں بنام ''انتخابِ مشکوٰۃ'' شائع ہو گیا ہے۔

سید صاحب مزید لکھتے ہیں کہ:

> صاحبِ مقامات، مستجاب الدعوات اور وارداتِ صحیحہ سے سرفراز تھے۔ کالج سے پنشن لینے کے بعد اپنے گاؤں میں مقیم ہو گئے تھے اور متوسلین کو اپنے رشد وہدایت سے سیراب کرتے تھے، اسی عالم میں دو برس ہوئے کہ ۱۹۴۰ء میں ایک شب تہجد کے لئے اٹھے تو فالج کا حملہ ہوا، اس کے بعد امسال دوسرا حملہ ہوا جس کے علاج کے لئے جونپور آئے جہاں ۱۱/ مارچ ۱۹۴۴ء کو تیسرا حملہ ہوا اور زبان بند ہو گئی، وفات کے آخری لمحہ میں آخری بار زبان کھلی اور تین دفعہ بلند آواز سے ''اللہ اللہ'' کہا اور جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔
>
> عجیب بات یہ ہے کہ جونپور میں وہ بالکل مسافرانہ وارد تھے، لیکن حضرت تھانویؒ کے متعدد خلفاء، مجازین اور صحبت یافتہ بغیر کسی ظاہری داعیہ کے عین وقت پر پہونچ گئے، انھیں میں ایک نے یٰسین پڑھی، ایک نے غسل دیا، ایک نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور سب نے پڑھی اور دو نے قبر میں اتارا، جونپور ہی کی ایک اکبری مسجد کے عقب میں ۲/ بجے رات کو تدفین عمل میں آئی، رحمہ اللہ تعالیٰ۔''

جونپور میں جیسا کہ مولانا مجد القدوس سلّمہٗ لکھتے ہیں، حضرت مولانا الہ آبادیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ کے خویش جناب سید حسین صاحب کمشنر کے مکان پر بغرض علاج مقیم تھے اور علاج کرا رہے تھے اپنے پیر بھائی حضرت ڈاکٹر عبد الحی صاحب عارفیؒ سے! حضرت ڈاکٹر صاحب ہومیو پیتھ معالج تھے، حضرت تھانویؒ نے بھی اپنی

زندگی کے آخری ایام میں ڈاکٹر موصوف سے چندروز علاج کرایا تھا، اتباعِ شیخ میں غلبۂ عشق ومحبت نے حضرت مولانا کو بھی جونپور ان کے علاج سے استفادہ کے لئے پہونچادیا۔ اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ وفات کے وقت مفتی مجد القدوس سلّمہٗ کی خبر اور روایت (جوانھوں نے سید حسین صاحب کمشنر سے سنی، اور سید صاحب کے مضمون میں بھی اس کا ذکر بغیر نام کے ہے) کے مطابق حضرت تھانویؒ کے چار جید خلفاء بغیر کسی ظاہری سبب کے عین وقت پر پہونچ گئے، اور ایک صاحب تو معالج ہی تھے۔

(۱) خسرو بارگاہ تھانوی حضرت خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوب علیہ الرحمہ
(۲) حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری علیہ الرحمہ
(۳) حضرت علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ
(۴) حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی علیہ الرحمہ (معالج)
(۵) حضرت مولانا شاہ ابرارالحق صاحب مدظلہٗ

جو خود نیک وصالح تھا جس نے اپنی ساری زندگی عشق الٰہی کی سوز ومستی میں گزاری، جو سراپا دین تھا، دینداری کا نمونہ تھا اس کا آخری وقت بھی کتنا پاکیزہ ہوا! زبان فالج کی وجہ سے بند تھی مگر یکایک کھل گئی اور جو نام اس نے زندگی بھر رٹا تھا آخری وقت میں وہی نعرہ مستانہ لگاتا ہوا دنیا سے گزر گیا، اور آخری مرحلہ کے رفقاء ومعاونین جو دستیاب ہوئے، سبحان اللہ ایک سے بڑھ کر ایک، ان میں سے کوئی ایک اگر کسی کے جنازہ میں شریک ہوجائے تو میت کی خوش بختی ہے اور یہاں پانچ پانچ بیک وقت موجود ہیں، تجہیز وتکفین کا ہر کام عین سنت نبوی کے مطابق، اللہ اللہ اس موت پر زندگی نچھاور اور اس بیماری پر شفا نثار! حق تعالیٰ حضرت مولانا کے درجات اعلیٰ علیین میں بلند فرمائے۔

پہلے گزر چکا ہے کہ حضرت مولانا الہ آباد پنشن لینے آتے تھے، ایک بار تشریف

لائے اور حضرت مولانا قاری حبیب احمد صاحب مدظلہٗ حاضر ہوئے تو فرمایا ‘‘جتنی اختیاری سنتیں ہیں سب پر اپنے اختیار سے اہتمام کے ساتھ عمل کرتا رہا ہوں مگر ایک سنت غیر اختیاری ہے، جی چاہتا ہے کہ اس پر بھی عمل ہو جائے، وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کا وصال ۶۳ر سال کی عمر میں ہوا ہے، میں چاہتا ہوں کہ ۶۳ر سال میں میرا انتقال ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے لئے یہ آسان ہے کہ اس پر بھی عمل ہو جائے تو فالج کا اثر ہوا اور اس کے بعد وقفہ وقفہ سے دو تین بار حملہ ہوا، بالآخر ۶۳ر سال کی عمر میں وصال فرمایا۔ ایک سچے متبع سنت نے دل سے جو بات چاہی تھی اللہ تعالیٰ نے اسے پورا کر دیا۔ ؎

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں   می دہد یزداں مرادِ متقیں

☆☆☆☆☆☆☆☆

ضمیمہ (۴)

انیس بھائی مرحوم

وفات: ۱۴؍اکتوبر ۱۹۹۱ء

میں الہ آباد ۱۹۷۷ء میں پہونچا، وہاں پہونچنے کے بعد دل ودماغ نے جن حضرات سے ملتے ہی اخلاص ومحبت کی خوشبو محسوس کی اور جن سے بے ساختہ قریب ہونے، ان سے ملتے رہنے اور ان کی باتیں سننے کا جی چاہا ان میں ایک نمایاں شخصیت ندوہ سرائے ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے، انیس بھائی کی تھی، انیس بھائی کا تعارف کن لفظوں میں کراؤں، وہ میرے لئے بھائی کی عمر اور بھائی کے رتبے کے نہ تھے، باپ کی عمر اور رتبے کے تھے، لیکن حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامی اور حضرت قاری محمد مبین صاحب انھیں انیس بھائی کہتے تھے، انھیں سے سن کر میری زبان پر بھی یہی لفظ چڑھ گیا، اور پھر اس طرح یہ نام دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوگیا کہ اس لفظ کے علاوہ اور کسی لفظ سے انھیں پہچاننے میں دقّت محسوس کرتا ہوں۔

متوسط قد، چہرہ گول، کسی قدر لمبائی مائل، اس پر ہلکے ہلکے داغ، گندمی رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، داڑھی سفید، دانت چمکدار، سفید براق لباس، شرعی پاجامہ کرتا، سر پر پنچ گوشیہ ٹوپی، دبلا پتلا جسم، تنفُّس کے مریض، بدن کمزور، ہمت توانا، دل بیدار، دماغ ہوشیار، بہترین مُشیر، بہترین دوست، نہایت شریف انسان! یہ تھے **انیس بھائی !** ندوہ سرائے کے رہنے والے مگر وہاں رہے نہیں، عرصہ تک بھوپال میں رہے،

بھوپال میں ان کا بڑا فارم تھا پھر نہ جانے کیا ہوا کہ فارم فروخت کر دیا اور بمبئی میں کوئی جائداد بنالی، حضرت مصلح الامتؒ سے بیعت ہوئے، دانا تو تھے ہی، دل بھی محبت سے بھرپور تھا بہت جلد حضرت کے یہاں قرب واختصاص حاصل کرلیا۔ بعد میں حضرت قاری محمد مبین صاحب کے سمدھی بھی ہوگئے، ان کے فرزندِ گرامی مولانا عرفان احمد صاحب قاری صاحب کے داماد ہیں۔

میں جب الہ آباد پہونچا تو وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ حضرت مولاناؒ ہی کے مکان کے ایک حصہ میں مقیم تھے۔ اس وقت مدرسہ اور خانقاہ اور حضرت قاری صاحب ایک ابتلائی دور سے گزر رہے تھے، انیس بھائی ایسے میں حضرت قاری صاحب کے لئے ڈھارس کا سامان تھے۔

بات کے کھرے اور زبان کے سچے، بزرگوں کے عقیدت کیش اور نیاز مند، حضرت مصلح الامتؒ کے عاشق وشیدا، وہ اور جامیؔ صاحب اکٹھا ہوتے تو اول سے آخر تک زیادہ تر حضرت ہی کا تذکرہ ہوتا رہتا، خلوت کے شیدائی تھے لیکن جب کوئی ہم مزاج اور ہم مشرب مل جاتا تو خوب باتیں کرتے اور دیر تک کرتے، ان کی زبان سے میں نے حضرت کی باتیں بہت سنی ہیں، ان سے سنی ہوئی چند باتیں ناظرین کو بھی سنادوں، ایک بار فرمایا:

حضرت کی خدمت میں میرٹھ کے ایک شیخ الحدیث غالباً مولانا لائق علی صاحب تشریف لائے، بوڑھے آدمی تھے، حضرت سے ملے، مصافحہ ہوا، معانقہ ہوا اور اس کے بعد زور سے چیخ مار کر رونے لگے، حضرت ہائی بلڈ پریشر کے مریض تھے، ان کے اس بے تحاشا رونے سے حضرت متاثر ہوئے، چاہا کہ تھوڑی دیر کے لئے مولانا وہاں سے ہٹ جائیں، انیس بھائی موجود تھے، انھیں آہستہ سے اشارہ کر کے فرمایا کہ انھیں لے جاؤ اور چائے وغیرہ پلادو، انیس بھائی کہتے تھے کہ میں انھیں حضرت کے

پاس سے اٹھالایا، گریہ کا طوفان تھم چکا تھا مگر سسکیاں باقی تھیں، انیس بھائی نے پوچھا کہ حضرت آپ اس زور سے کیوں روئے، انھوں نے بھرائی آواز میں جواب دیا کہ بھائی میں بڑا گنہگار آدمی ہوں، حضرت کے چہرۂ اقدس پر نظر پڑی تو میرے سب گناہ ایک دم آئینہ ہوگئے، میں اپنی گنہگاری دیکھ کر ضبط نہ کرسکا، بھائی میں بڑا گنہگار ہوں یہ کہہ کر پھر رونے لگے۔ انیس بھائی نے دیکھا کہ یہ پھر سابقہ حال پر آگئے تو انھوں نے برجستہ کہا کہ حضرت آپ کی بڑائی بہت چیزوں میں تسلیم ہے، آپ بڑے عالم ہیں، بڑے بااخلاق ہیں، بڑے بزرگ ہیں، ان سب چیزوں میں ہم آپ کی بڑائی مانتے ہیں، لیکن یہ کیا کہ سب بڑائیاں ہم آپ ہی کے لئے تسلیم کرلیں اور یہ بھی مان لیں کہ آپ ہی بڑے گنہگار بھی ہیں، جی نہیں، اس میں ہم آپ سے بہت بڑے ہیں۔

اس پر مولانا موصوف ہنس پڑے، پھر انیس بھائی نے انھیں اہتمام سے چائے پلائی۔

انیس بھائی بتارہے تھے کہ ایک بار حضرت نے گیارہ بجے شب کے بعد مجھے بلوایا، میں حاضر ہوا تو فرمایا کہ مسجد میں جاؤ، فلاں جگہ ایک صاحب ہوں گے انھیں بلالاؤ۔ میں سوچنے لگا کہ صرف اتنے کام کے لئے حضرت نے اتنے اہتمام سے کیوں بلوایا لیکن خیال کیا کہ حضرت کا کوئی کام حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا اس میں بھی کوئی حکمت ہوگی، چنانچہ وہ مسجد میں گئے وہاں پہونچ کر جو منظر دیکھا تو کہہ رہے تھے کہ میری آنکھ کھل گئی، جن صاحب کو بلایا تھا انھیں دیکھا کہ کھڑے ہوکر دربار الٰہی میں مشغول مناجات اور محو دعا و نیاز ہیں اور اس انہماک سے کہ ادھر اُدھر کا ذرا ہوش نہیں، آنسو تھے کہ موتیوں کی طرح ٹپ ٹپ گر رہے تھے میں حیران تھا کہ انھیں کس طرح آواز دوں، یہ خدا سے مناجات میں مشغول ہیں میں مخل کیوں کرہوں، میں وہیں بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اللہ اکبر اس خانقاہ میں اللہ کے کیسے کیسے نیک بندے آتے ہیں

انھیں اللہ کے ساتھ کیسا والہانہ لگاؤ تعلق ہے۔ میرے دل میں یہ بات آئی کہ حضرت نے اسی لئے بطورِ خاص مجھے بھیجا ہے کہ اس روح پرور اور ایمان افروز منظر سے میں بھی اثر لوں، میں دیر تک بیٹھا رہا جب انھیں اس کیفیت سے قدرے افاقہ ہوا تو حضرت کا پیغام سنایا پھر وہ آنسو پوچھتے ہوئے حضرت کی خدمت میں حاضری کیلئے چل پڑے۔

ایک روز بیان کر رہے تھے کہ مجھے اپنی نماز میں ریا کا شبہ بہت ستاتا تھا، میرے دل میں بار بار خیال آتا تھا کہ میری نماز سراسر ریاکاری پر مبنی ہے۔ ایک روز اپنے دل کی یہ بات میں نے حضرت سے عرض کی، تو فرمایا کہ تم مجھے کیسا سمجھتے ہو؟ میں نے کہا نہایت مخلص، اللہ کا ولی کامل اور انتہائی متقی و پرہیزگار سمجھتا ہوں، فرمایا تم مجھے ایسا سمجھتے ہو، میں تم سے کہتا ہوں کی یہ لوگ میری نماز بھی نہیں دیکھتے تو پھر تمہاری نماز کیا دیکھیں گے، پھر ریا کیسی، ریا کا تعلق تو دوسروں کے دکھاوے سے ہے، میاں کہیں مخلوق کے دکھاوے کے لئے نماز پڑھی جاتی ہے۔ **لاحول ولاقوة الاباللہ** اس کو دو تین بار فرمایا۔

انیس بھائی کہتے تھے کہ اس کے بعد پھر کبھی اس کا دھیان نہیں رہا کہ کوئی دیکھتا ہے یا نہیں۔

انیس بھائی نہایت دانا وزیرک تھے اسی طرح نہایت شجاع اور ہمت ور بھی تھے، ان کے دل میں خوف ودہشت نام کی کوئی چیز نہ تھی، اسی وجہ سے قول کے بہت سچے تھے نہ انھیں دوسروں کو ٹوکنے میں کوئی دغدغہ تھا اور نہ ہی اپنی غلطی کے اقرار کرنے میں کوئی تامل تھا۔

جس گھر میں وہ رہتے تھے اس میں دوہری آبادی تھی، نیچے یہ لوگ رہتے تھے اوپر ایک پٹنی تھی، پٹنی کیا نیچی چھتوں والی دوسری منزل تھی، چونکہ اس کی چھت سر کو چھوتی تھی اس لئے وہ قابل رہائش نہ تھی، غالباً سامان وغیرہ رکھنے کے لئے بنائی گئی تھی، اس

وقت وہ بالکل خالی تھی، آثار سے معلوم ہوتا تھا کہ اس میں جنات آباد تھے، اس کے دروازے میں ہمہ وقت قفل بند رہتا تھا، گھر کی عورتیں کبھی کبھی جھاڑو بہارو کرنے کیلئے اس میں جاتی تھیں، ایک دن ایک لڑکی گئی تو دیکھا کہ اس میں پاخانہ ہے، وہ ڈر گئی کہ اس میں بلّی کے گھسنے کی جگہ تو ہے نہیں یہ پاخانہ کہاں سے آیا؟ وہ فوراً اتر آئی، انیس بھائی سے کہا تو یہ بے تکلف اوپر گئے اور خود ہی پاخانہ اٹھا کر پھینک دیا اور قفل بند کر کے کنجی اپنے پاس رکھ لی، دوسرے دن جا کر دیکھا تو پھر پاخانہ جگہ جگہ پڑا تھا انھوں نے دوبارہ اٹھا کر پھینک دیا اور مقفل کر کے کنجی اپنے پاس رکھ لی، تیسرے دن پھر یہ قصہ ہوا تو انھوں نے زور سے پکار کر کہا کہ کمبختو! خوب ہگو، ہم تمہارے بھنگی ہیں روز پھینکتے رہیں گے اور کچھ سخت سست کہا، اس کے بعد سے یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ اس طرح کے کئی واقعات وہ سنایا کرتے تھے۔

بزرگوں کی خدمت میں حاضری دینے کا انھیں بہت شوق تھا، بھوپال میں ایک بزرگ شاہ عبدالخالق صاحب نقشبندی تھے، ان کی خدمت میں بھی یہ گاہے ماہے حاضر ہوا کرتے تھے ان کے یہاں چائے کا دور برابر چلتا رہتا تھا اور یکے بعد دیگرے پان کی گلوریاں بھی گردش میں رہا کرتی تھیں، ایک روز انھوں نے انیس بھائی کو پان پیش کیا، انیس بھائی کہتے ہیں کہ میں نے معذرت کی انھوں نے اصرار کیا کہ ایک کھالو، لیکن میں اپنے انکار پر جم گیا مگر وہاں سے نکلنے کے بعد میرا حال یہ ہوا کہ بے تحاشہ پان کی خواہش دل میں پیدا ہوئی، بھوپال میں پان کی دوکانیں قریب قریب ہیں، کہتے ہیں کہ میں نے ایک دوکان سے پان لے کر کھایا چند قدم کے بعد دوسری دوکان سے کھایا، اسی طرح لگاتار دن بھر پان کھاتا رہا۔ دوسرے دن حاضر ہوا تو پھر انھوں نے پان پیش کیا میں نے پھر انکار کیا کر دیا اس روز کل سے زیادہ پان کا تقاضا رہا، دن بھر میں پچاسوں پان کھا گیا اور دن بھر پریشانی رہی، تیسرے دن میں خوب منہ صاف

کر کے گیا تا کہ پان کا کوئی دھبہ دانتوں پر باقی نہ رہے، آج بھی انھوں نے پان پیش کیا اور میں نے حسب معمول انکار کردیا، انھوں نے آہستہ سے کہا میاں کھالو بہت پریشانی ہوتی ہے۔ انیس بھائی چونکے اور پان کھالیا، اس کے بعد پھر پان کی خواہش نہیں ہوئی۔ فرماتے تھے کہ میں نے اپنے دل میں سوچ لیا کہ بزرگوں کی بات مان لینے میں ہی خیریت ہے۔

انیس بھائی عرصہ تک الہ آباد میں رہے، ندوہ سرائے میں آبائی مکان تھا، وہ اپنے چھوٹے بھائی کو دیدیا تھا، انھیں ندوہ سرائے منتقل ہونے کا خیال ہوا تو کھیت میں ایک مکان کی بنیاد ڈال دی اور جب وہ کسی درجہ میں رہائش کے قابل ہوگیا تو اپنے اہل وعیال کو لے کر گاؤں میں آگئے۔ یہ مکان آبادی سے الگ تھلگ بنوایا ہے جو ان کے ذوقِ خلوت کے آثار میں سے ہے۔

انیس بھائی انگریزی داں تھے مگر سر سے پاؤں تک کہیں اس کا اثر محسوس نہیں ہوتا تھا، حضرت مولانا کی برکت سے خالص دینداری ذوق وطبیعت بن گئی تھی، اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم میں لگایا بھی نہیں، بڑے صاحبزادے مولانا عرفان احمد کو حفظ کرایا، عربی تعلیم دلائی، انھوں نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، ان سے چھوٹے مولوی انوار احمد سلّمہٗ نے بھی حفظ کی تکمیل کی، اور وصیۃ العلوم کے بعد دارالعلوم دیوبند سے تعلیم کی تکمیل کی (افسوس نوعمری میں بیمار ہوئے اور انتقال کرگئے)۔ ان سے چھوٹے مولوی سلمان احمد سلّمہٗ بھی مظاہر علوم سہارنپور سے فارغ ہیں، سب سے چھوٹے عزیزم نعمان احمد سلّمہٗ تعلیم کی تکمیل نہ کرسکے۔

انیس بھائی تنفس کے مریض تھے، دوا کھاتے رہتے تھے، بیماری کی حکایت شکایت کے عادی نہ تھے، اسے رفیق زندگی سمجھ رکھا تھا، شدید حملہ ہوتا تو گھر سے نکلنا بند ہوجاتا تھا کچھ اچھے ہوتے تو نماز اور دوسری ضروریات کیلئے آمدورفت ہونے لگتی،

بیماری میں گھلتے رہے، جسم کمزور ہوتا گیا مگر طبعی اور روحانی قوت کا اثر تھا کہ طبیعت نشاط پر رہتی، مسکراتے رہتے، ہنستے رہتے، باتیں کرتے رہتے، بالآخر اسی طرح ہنستے مسکراتے ایک دن سب کو روتا چھوڑ کر اس دربار میں پہونچ گئے جس کی تیاری میں انھوں نے اپنی دنیا، دنیاوی تعلیم اور اس کی رونق اور چمک دمک کو تج دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی کریم ذات سے امید ہے کہ وہ ان پر اپنی مغفرت کی چادر پھیلا چکے ہوں گے۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۹۱ء دوشنبہ کے دن بعد مغرب نبض کا نظام بگڑا سانس تیز تیز چلنے لگی اور اخروی زندگی سے قریب تر ہوتے گئے، اسی عالم میں ٹھنڈے پانی سے منہ دھویا، سورۂ یٰسین شریف بلند آواز سے پڑھنے کا حکم دیا، اس وقت بھی پورے ہوش میں تھے، آیات مبارکہ کو سنتے ہوئے روح عالم بالا کو پرواز کر گئی۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

☆☆☆☆☆☆☆

ضمیمہ (۵)

داروغہ جی (مشتاق احمد صاحب)

وصیۃ العلوم الہ آباد کی مدرسی کے ابتدائی دور میں غائبانہ ایک داروغہ جی کا تذکرہ سنا کرتا تھا، یہ نام زیادہ تر مولانا عرفان احمد صاحب لیا کرتے تھے، داروغہ جی کا بھتیجا وہاں پڑھتا تھا، داروغہ جی کا ذکر احترام اور محبت کے ساتھ ہوتا۔

ہمارے زمانہ میں داروغہ ہو، اور نیک ہو، یہ دونوں باتیں قطعی متضاد ہیں، جب کسی داروغہ کا نام آتا ہے تو تصور کے پردے پر ایک تُرش رو، غصہ ور اور بھیانک آدمی کی صورت سامنے آتی ہے جو غصہ میں گالیاں بک رہا ہے، یا کسی پر ڈنڈے برسا رہا ہے یا زبردستی رشوت کے پیسے اینٹھنے کی فکر میں ہے۔

مشہور ہے کہ ایک بزرگ کو کسی سپاہی نے بے وجہ ایک ڈنڈا رسید کردیا، ان بزرگ نے اسے دیکھا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں داروغہ بنادے، وہ یہ سن کر بہت متاثر ہوا کہ میں تو انھیں تکلیف دے رہا ہوں اور یہ مجھے دعا دیتے ہیں۔ اللہ کا کرنا کہ وہ واقعی ترقی پاکر داروغہ ہوگیا، اب وہ ان بزرگ کی خدمت میں شکریہ ادا کرنے کے لئے حاضر ہوا، اور درخواست کی کہ آپ نے میرے اوپر بڑا احسان کیا کہ ایسی اچھی دعاء دی، اللہ نے آپ کی دعاء سن لی اب میں داروغہ ہوں، آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو فرمائیں، میں حاضر کردوں گا، انھوں نے کہا مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں، تم اپنا کام کرو۔ وہ بار بار اصرار کرتا رہا، آپ نے فرمایا اچھا بڑے سے بڑا بچھو جو تم کو مل سکتا ہو وہ

حاضر کرو، اسے کمالِ حیرت ہوئی کہ بچھو کی کیا ضرورت ہے؟ فرمایا کہ مجھے اسی کی ضرورت ہے، لاسکو تو لاؤ۔ اس نے ہر طرف پہاڑیوں پر سپاہی دوڑائے اور بڑے سے بڑا بچھو تلاش کرایا، لیکن وہ جو لے جاتا فرماتے کہ اس سے بڑا چاہئے، بہت تلاش وجستجو کے بعد ایک بہت بڑا بچھو ملا، اسے لے کر آیا، فرمایا کہ مجھے اس سے بڑا چاہئے، اس نے انکار کیا اور کہا کہ اس سے بڑا نہیں مل سکتا، انھوں نے کہا کہ میرے ساتھ چلو میں تمہیں دکھاؤں، وہ اسے لے کر ایک قبر کے پاس گئے، اور فرمایا کہ اسے کھدواؤ، اس نے سپاہیوں سے کھدوانا شروع کیا، تھوڑی دیر کے بعد اس میں ایک لاش ملی، دیکھا کہ اس پر ایک بڑا سا ٹوکرے کے برابر بچھو بیٹھا ہوا ہے جو برابر اسے ڈنک مار رہا ہے، اور جب ڈنک مارتا ہے تو لاش میں آگ لگ جاتی ہے، پھر وہ درست ہو جاتی ہے۔ کھودنے والا چیخ مار کر بے ہوش گیا، داروغہ کے بھی اوسان خطا ہو گئے، گھبرا کر پیچھے ہٹا، فرمایا پیچھے نہ ہٹو، غور سے دیکھو، یہ ایک داروغہ کی لاش ہے، اور اسی پر یہ بچھو مسلط ہے، میں نے درحقیقت تم پر بددعاء کی تھی، وہ رونے لگا اور پھر اپنی ملازمت چھوڑ کر انھیں کی خدمت میں رہ پڑا۔

تو داروغہ کی سوانح حیات یہ ہے، لیکن مولانا عرفان احمد صاحب کس داروغہ کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ نہایت دیندار، متشرع اور صوفی ہیں، حضرت مولاناؒ کے عاشق وخادم ہیں، حضرت انھیں بہت مانتے تھے، کیا داروغہ انسانی مخلوق ہوتا ہے جس میں یہ اوصاف حمیدہ پائے جائیں؟ میں نے پوچھا بھی کہ وہ واقعی تھانے والے داروغہ ہیں یا یہ ان کا نام ہے؟ معلوم ہوا کہ واقعی تھانیدار ہیں، خیر ہوں گے کوئی، لوگ مبالغہ تو کیا ہی کرتے ہیں، لیکن کیا جامؔی صاحب بھی مبالغہ کریں گے؟ کیا انیس بھائی بھی خلاف احتیاط کوئی بات کہیں گے؟ آخر یہ سب لوگ بھی تو ان کی تعریف ہی کرتے ہیں۔

ایک روز درسگاہ سے فارغ ہو کر خانقاہ میں واپس آیا، تو ایک نئی صورت دکھائی

دی، ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہوئے گھر میں چلا گیا، مگر وہ صورت رہ رہ کر دل میں کھٹکتی تھی، کوئی عالم ہیں؟ کوئی بزرگ ہیں؟ کیا روشن چہرہ ہے؟ کیسی خوبصورت سفید داڑھی ہے، سراپا کتنا پُر نور ہے، لمبا قد، چھریرا بدن، ہڈیاں چوڑی، اعضاء متناسب، سر پر حضرت مولانا والی گول ٹوپی، کرتا پاجامہ صالحین والا، شاید حضرت کے متوسلین میں کوئی صاحب تشریف لائے ہیں۔

پھر دوسرے وقت دیکھا کہ جامؔی صاحب، انیس بھائی اور مولانا عرفان احمد صاحب ان سے بے تکلف باتیں کر رہے ہیں، میں نے ان کے اندر ایک خاص کشش محسوس کی، میں نے بھی ادب سے مصافحہ کیا، میں خانقاہ میں اجنبی تھا، حضرت کے متوسلین مجھے نہیں پہچانتے تھے، غالباً جامؔی صاحب نے میرا تعارف کرایا، میں بھی منتظر تھا کہ ان کا بھی تعارف ہو، مولانا عرفان احمد صاحب نے کہا کہ یہی داروغہ جی ہیں، کلہاپور والے۔

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں کسی داروغہ کو دیکھ رہا ہوں، میں نے سوچا بوڑھے آدمی ہیں شاید ریٹائر ہو چکے ہوں اور اس کے بعد بزرگی کا پیشہ اختیار کرلیا ہو، کیونکہ بہت سے پولیس والے ریٹائر ہونے کے بعد دعاء تعویذ اور فقیری کا پیشہ اختیار کرلیتے ہیں، لیکن مغرب بعد دیکھا کہ اپنی وردی درست کر رہے ہیں، جوتے کی پالش، کندھے کے ستارے، موزہ وغیرہ کی دیکھ بھال میں مصروف ہیں، میں نے ہنس کر پوچھا کہ کیسی تیاری ہے، کہنے لگے رات کی ڈیوٹی ہے، کوتوالی جا رہا ہوں، اور اب کیا دیکھتا ہوں کہ دن بھر جو درویش خدا مست نظر آیا تھا اب وہی وردی پہن کر خاصا داروغہ بن گیا ہے، صرف داڑھی ایک زائد چیز لگ رہی تھی اور مونچھوں کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔

یہ ہیں ہمارے داروغہ مشتاق احمد صاحب جو اب ریٹائر ہو چکے ہیں، اور ندوہ سرائے سے متصل اپنے وطن کلہاپور میں مقیم ہیں۔

دینداری کا کمال اور طاعت وتقویٰ کا یہ حسن وجمال دین ہے اس پیر فتح پور کی جس

کی نگاہ مومنانہ اور نفس گرم نے نہ جانے کتنی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ حضرت مولانا سے بیعت کا شرف بھی انھیں حاصل ہے، اور جب موقع ملتا حضرت کی خدمت میں پہونچ جاتے اور حضرت کی خدمت کرتے، حضرت جب تفریح کیلئے کہیں تشریف لیجاتے تو یہ اپنی سائیکل لئے آپ کے دور نزدیک رہا کرتے، حضرت مولانا کا اعتماد انھوں نے حاصل کر لیا تھا، حضرت مولانا کے واقعات وملفوظات یہ بھی خوب سنایا کرتے تھے۔

داروغہ جی داروغہ رہے، لیکن ظلم وستم، رشوت ستانی اور لوٹ مار کی نجاست سے ہمیشہ اپنا دامن بچائے رکھا، اسی لئے وہ ایسی جگہیں تلاش کیا کرتے تھے جہاں عوام سے رابطہ کم سے کم ہو، اسی تلاش میں انھوں نے اپنا آخری تبادلہ الہ آباد کوتوالی میں کرایا کہ خانقاہ کی جاروب کشی کریں گے اور کنٹرول روم میں جہاں عوام سے کوئی مطلب نہیں ڈیوٹی کریں گے۔

جاروب کشی میں نے بطور محاورہ نہیں لکھی ہے، وہ واقعی بعد نماز فجر قرآن کریم کی تلاوت اور مناجات مقبول کی ایک منزل پڑھ کر فارغ ہوتے تو جھاڑو ہاتھ میں لے کر پہلے اپنے کمرے کی جو حضرت قاری صاحب نے ان کے لئے مختص کر دیا تھا، اور وہ معمولی کھپریل تھا اس میں جھاڑو لگاتے، پھر پوری خانقاہ میں جھاڑو لگاتے، اس کے بعد غسل کرکے یا ہاتھ منہ دھوکر، ناشتہ کرتے، صبح کی ڈیوٹی نہ ہوتی تو حضرت قاری صاحب کی مجلس میں حاضری دیتے ورنہ کوتوالی چلے جاتے۔

ایک بار غازی پور سے ایک صاحب میرے پاس علی الصباح آئے، انھوں نے داروغہ جی کو خانقاہ میں جھاڑو لگاتے دیکھا پھر کچھ دیر کے بعد انھوں نے کمرے سے پوری وردی میں ایک بارعب داروغہ کو نکلتے دیکھا تو سنبھل کر بیٹھ گئے، اور مجھ سے گھبرا کر دریافت کرنے لگے، یہ داروغہ یہاں کیوں آئے ہیں؟ میں نے کہا یہ یہیں رہتے ہیں، ابھی آپ نے ایک شخص کو جھاڑو لگاتے ہوئے دیکھا تھا؟ انھوں نے کہا ہاں، میں

نے بتایا کہ یہ وہی ہیں، تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی، کہ کیا داروغہ بھی ایسا ہوتا ہے؟

میں ان کے ساتھ غالباً تین سال رہا ہوں، اپنے اوقات ومعمولات کے پابند، باغ وبہار شخصیت کے مالک ہیں، محبت کرنا خوب جانتے ہیں، اور اسے نباہنا بھی خوب جانتے ہیں، دینداری ان کے مزاج وطبیعت میں راسخ ہے، حضرت کے تذکرہ میں یہ بھی برابر شریک رہتے تھے، دین کی باتیں سب کو سنا دیتے ہیں، جہاں داروغہ رہے وہاں مسلمانوں میں دینداری کا ماحول پیدا کر دیا۔

کان پور کے کسی حلقے میں عرصہ تک رہے، وہاں کے لوگ اب تک یاد کرتے ہیں، پانچوں وقت مسجد میں پہونچتے تھے، اور راہ چلتے اور ادھر ادھر بیٹھے مسلمانوں کو بھی نماز کی تاکید کرتے، داروغہ جی کی تلقین بھلا کیوں نہ اثر کرتی، وردی کی طاقت ظاہر ہی ہے، مسجد جو پہلے نمازیوں کو ترستی تھی، ان کے اثر سے بھرنے لگی، نماز پڑھانے سے تو اب بھی گھبراتے ہیں اور اس وقت تو اور نہیں پڑھانا چاہتے تھے، لیکن محلّہ کے لوگ جانتے تھے کہ ہم سے زیادہ نیک ہیں، اس لئے کبھی کبھی امامت کی خدمت بھی انھیں انجام دینی پڑتی تھی۔

سلام کرنے میں ان سے سبقت کرنا مشکل ہے، کان پور میں رہے تو باوجود اپنے اس مہمل منصب کے سب کو خود سلام کرتے تھے، بالخصوص بچوں کو، ان سے خیریت بھی پوچھتے، اور انھیں جواب میں الحمد للہ کہنا سکھاتے، بچوں کو اس تعلیم میں اتنا پختہ کر دیتے تھے کہ بچے سلام کا جواب دینے کے ساتھ ہی الحمد للہ الحمد للہ کا شور بھی مچانے لگتے۔ خاص خاص اوقات کی دعائیں اپنے چھوٹوں کے درمیان ہوتے تو بلند آواز سے پڑھتے تاکہ وہ بھی سیکھ جائیں اور احتساب بھی کرتے رہتے کہ وہ لوگ پڑھتے ہیں یا نہیں؟

پولیس والوں کو سنورنے اور سجنے میں آئینہ بہت دیکھنا پڑتا ہے، ایک روز میں نے ان سے پوچھا کہ اس قدر اہتمام کیوں کرتے ہیں؟ کہنے لگے دلہن اور پولیس

والوں کی آرائش یکساں اہتمام سے ہوتی ہے، دلہن اپنے شوہر کے حضور جاتی ہے اور پولیس کو اپنے افسر کے سامنے کھڑا ہونا ہوتا ہے، وہ وردی کی ایک ایک چیز پر نگاہ ڈالتا ہے، کریز اور شکن تک کا جائزہ لیتا ہے، اگر ذرا بھی بے قاعدگی ہوگی تو اعمال نامہ خراب ہو جائے گا۔ واقعی یہ بڑی عبرت کی بات ہے دلہن اپنے شوہر کے لئے آراستہ کی جاتی ہے، پولیس اپنے افسر کی نگاہ میں بھانے کے لئے سنورتی ہے، خیال کرنے کی بات ہے کہ بندوں کو اپنے پروردگار کے حضور حاضر ہونا ہے، انھیں کس قدر سنورنا چاہئے، نظرگاہِ خلائق تو ظاہری شکل وصورت اور لباس ووضع ہے، لیکن نظرگاہِ خالق انسان کا قلب ہے، اس کے سنوارنے اور آراستہ کرنے کی کس قدر فکر کرنی چاہئے؟

تو داروغہ جی بھی آئینے میں اپنی ٹوپی، وردی کے ستارے اور بٹن وغیرہ دیکھا کرتے، لیکن یہ بھی دیکھا کہ جہاں آئینے پر نگاہ پڑی **أللهم أحسنت خلقي فاحسن خلقي** ضرور پڑھتے، اور شاید یہی راز ہے کہ صورت وسیرت دونوں ان کی سجی سجائی ہے۔

حضرتؒ کی وفات کے بعد بیعت کا تعلق ان کے جانشین حضرت مولانا قاری محمد مبین صاحب سے قائم کرلیا ہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد اب زیادہ تر وقت گھر اور الہ آباد میں گزرتا ہے، پہلے تو پابند ملازمت تھے، اب آزاد ہیں اور عبادت وطاعت میں سرگرم ہیں۔

داروغہ جی کو حج بیت اللہ کی سعادت اللہ نے بخشی، جس روز حج سے واپس آئے اس کے دوسرے روز اتفاقاً میں ان کے یہاں جا نکلا، حسب معمول بہت محبت اور تپاک سے ملے، ان سے مل کر بڑا سرور حاصل ہوتا ہے، دلی راحت ملتی ہے۔

بہت جی لگتا ہے صحبت میں ان کی ابھی کچھ لوگ ہیں باقی جہاں میں

اللہ تعالیٰ ان کی عمر، عمل اور ایمان میں برکت دے، آمین

ضمیمہ (٦)

تقریر قُبیل نمازِ عید الفطر (۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۲ء)

والد ماجد علیہ الرحمہ عیدین میں ڈائری پر تقریر سے متعلق یادداشت لکھ کر مسجد تشریف لے جاتے اور اس کو سناتے ، درمیان میں ’’شرحِ جامی‘‘ کرتے رہتے تھے۔ عیدین کی دو تقریر اور ایک تقریر جس کا عنوان ’’مسلم لڑکیاں اور موجودہ تعلیم دنیوی‘‘ ہے، ان کے کاغذات میں دستیاب ہوگئیں، ان کو اس سوانح میں شامل کیا جارہا ہے۔ (محی الدین جامؔی ابن حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامؔی)

ابن سلامہ نے حضرت امام غزالیؒ سے اپنے لئے کچھ پند و نصیحت کی درخواست کی ، امام غزالیؒ نے اس کے جواب میں انھیں لکھا کہ میرے کانوں تک آپ کی یہ بار پہونچی کہ آپ نے مجھ سے کچھ وعظ و نصیحت طلب فرمایا ہے اور یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ میں آپ کو کچھ مختصر لیکن مفید تر نصیحت کروں ، تو عزیز من ! سب سے پہلی بات تو اس سلسلے میں یہ عرض کرنی ہے کہ بندہ اپنے کو اس کا اہل ہی نہیں پاتا کہ وہ آپ کو کوئی نصیحت کرے ، اس لئے کہ مہربانِ من ! وعظ کی مثال زکوٰۃ کی سی ہے جس کے لئے صاحب نصاب ہونا شرط ہے، اور اس کا نصاب ہے خود اور اللہ رسول کی نصیحتوں کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھنا یعنی اصلاح فرع ہے صلاح کی ، پس جو شخص خود ہی نصیحت نہ قبول کئے ہوئے ہو گویا نصاب سے خالی ہو وہ دوسروں کو کیا نصیحت کرسکتا ہے، یعنی جو

خود صالح نہ ہو اس کے لئے مصلح ہونا کب زیب دیتا ہے، کیونکہ جو صاحب نصاب نہیں وہ بھلا زکوٰۃ کیا نکالے، یوں سمجھئے کہ خود نور سے عاری ہو تو اس سے دوسرے لوگ بانور کیونکر ہو سکتے ہیں، اور سایہ بھلا کب سیدھا ہو سکتا ہے جب کہ لکڑی ٹیڑھی ہو، اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تاکیدی نصیحت فرمائی ہے کہ اے ابن مریم! پہلے اپنے آپ کو نصیحت کرو، جب تمہارا نفس نصیحت کو تم سے قبول کر لے تو پھر دوسروں کو نصیحت کرو ورنہ مجھ سے شرم کرو، اور ہمارے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ لوگو! میں تمہارے درمیان دو واعظوں کو چھوڑے جاتا ہوں، ایک تو اُن میں واعظِ ناطق یعنی گویا اور بولنے والا ہے، اور دوسرا خاموش مبلغ ہے، پس مبلغ ناطق تو قرآن ہے اور خاموش مبلغ تمہارے لئے موت ہے۔

اور شخص نصیحت کو قبول کرنا چاہے اس کے لئے اِن میں دو میں کفایت ہے یعنی یہ دو اس کے لئے بہت کافی ہیں، اور جس نے اِن دونوں سے نصیحت نہ حاصل کی تو اس کے لئے کوئی وعظ اور نصیحت کافی نہ ہوگی، چنانچہ میرا حال تو یہ ہے کہ میں نے خود کو اِن دونوں پر پیش کیا یعنی دونوں نصیحتوں سے متاثر کرنا چاہا مگر دیکھا یہ کہ نفس نے قول اور علم کے درجہ میں تو دونوں کی تصدیق کی لیکن عمل اور فعل کے درجہ میں دونوں کا انکار کیا، میں نے اپنے نفس سے کہا کہ تجھ کو اس میں کچھ کلام ہے کہ قرآن حکیم ایک واعظِ ناطق ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا ایسا کلام ہے کہ: **لایاتیه الباطل من بین یدیه ولا من خلفه۔** اس نے کہا نہیں بالکل نہیں، یہ بات مجھے بالکل تسلیم ہے اور قطعاً حق ہے، میں نے کہا کہ پھر اللہ تعالیٰ نے تو قرآن میں یہ فرمایا ہے کہ: **من کان یرید الحیوٰة الدنیا وزینتها نوف إلیهم أعمالهم فیها وهم لایبخسون ○ اولئک الذین لیس لهم فی الاٰخرة إلا النار وحبط ماصنعوا فیها وباطل ما کانوا یعملون ○** تو دیکھ اللہ تعالیٰ نے تو اِس ارشاد میں طالب دنیا کے لئے جہنم کی دھمکی دی ہے اور یہ سمجھ

لے کہ جو شے مرنے کے بعد تیرا ساتھ چھوڑ دے وہ سب دنیا ہی ہے، تو اب سوچ کر بتلا کہ دیندار یا دنیادار طالب مولا ہے یا طالب دنیا، اور یہ بھی دیکھ کہ اگر کوئی نہیں عیسائی ڈاکٹر تجھ سے تیری کسی عزیز تر اور لذیذ تر شے کے متعلق کہہ دے کہ اگر تم نے اس کو استعمال کیا تو مر جاؤ گے یا کسی شدید مرض میں مبتلا ہو جاؤ گے تو تُو اس سے کس قدر بچے گا اور پرہیز کرے گا، اب یہ بتلا کہ کیا وہ نصرانی تیرے نزدیک اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچا ہے، اگر تیرا یہی خیال ہے تو تُو اپنے ایمان کی خیر منا، اور کیا وہ بیماری تیرے نزدیک دوزخ سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے؟ اگر تو اِسی کا قائل ہے تو تجھ سے بڑھ کر کوئی جاہل نہیں، میرے اس سوال پر وہ چپ سا ہو گیا جیسے کہ میری بات اس کو سمجھ میں آ گئی، لیکن دیکھتا کیا ہوں کہ جب عمل کا وقت آیا تو پھر وہی دنیا طلبی اور احکام شکنی، جب اِس نصیحت کو اُس پر کارگر نہ پایا تو میں نے اُس دوسرے خاموش واعظ کا سہارا پکڑا، اور اُس سے کہا کہ قرآنِ ناطق نے جو واعظِ صامت کی خبر دی ہے، یہ کیسی خبر ہے؟ اس کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے، موت بھی کبھی آنی ہے یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ نے تو اس کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ: **قل إن الموت الذی تفرون منه فانه ملقیکم ثم تردون إلیٰ علم الغیب والشهادة فینبئکم بما کنتم تعملون ۔** میں نے اس سے یہ کہا کہ مانا کہ تیرا میلان دنیا کی طرف ہے، اچھا یہ بتلا کہ تجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ نہیں کہ موت کا آنا یقینی ہے اور یہ کہ جب وہ آئے گی تو اچانک آ جائے گی، اُسے کوئی شے روک نہ سکے گی اور اس کے آنے کی وجہ سے تیرے عیش وعشرت کا بالکلیہ خاتمہ اور تیری ساری لذّات کی کرکری ہو جائے گی، اور سب چیزیں تجھ سے چھین لی جائیں گی، اور جس شے کا آنا یقینی ہو وہ دور بھی ہو تو قریب ہے، اور جو شے گزر گئی وہ اب دور ہی ہوتی جائے گی، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: **أفرأیت إن متعنهم سنین ثم جاء هم ماجکانوا یوعدون ماأغنیٰ عنهم ما کانوا یمتعون ۔** اچھا اگر ہم ان کو چند سال

کی مہلت بھی دیدیں اوراس کے بعدان کے پاس وہ چی آجائے جس کا ان سے وعدہ کیا گیاہے تو یہ درمیانی نفع اٹھانااس کے لئے حشر کے باب میں کیا نفع بخش ہوگا؟ میں نے کہااے نفس! دیکھ یہ ناصح کہہ رہاہے کہ ؎

ایک دن مرناہے آخر موت ہے　　　کرلے جوکرناہے آخر موت ہے

اور ببانگِ دہل یہ اعلان کررہاہے کہ دنیامیں ہماراحال تو یہ ہے کہ ؎

یہ عالم عیش وعشرت کا یہ حالت کیف ومستی کی
بلند اپنا تخیل کر یہ سب باتیں ہیں پستی کی
بس اتنی سی حقیقت ہے فریبِ خوابِ ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہوجائے

اور دنیا کا حال یہ ہے کہ ؎

کسی کو رات دن سرگرمِ فریاد وفغاں پایا
کسی کو فکر گوناگوں میں ہر دم سرگراں پایا
کسی کو ہم نے آسودہ نہ زیرِ آسماں پایا
بس اک مجذوبؔ کواس غمکدہ میں شادماں پایا
جو بچنا ہوغموں سے سے آپ کادیوانہ ہوجائے

میری اس تقریر سے وہ قدرے متاثر ہوا، اور کہا کہ آپ بالکل سچ فرماتے ہیں، حال تو یہی ہوناہے، لیکن دیکھا یہ ہے کہ یہ حرف زبانی تاثر رہا، قلب میں اور حال وعمل میں اس کا کوئی اثرنہیں ہوا بلکہ　ع

وہی رفتارِ بے ڈھنگی جو پہلے تھی سواب بھی ہے

کا مصداق بنارہا، یعنی یہ کہہ دینا کہ دنیا کے لئے کس قدر جدوجہد ہوتی ہے آخرت کے لئے کچھ نہیں، اپنے نفس اور مخلوق خوش رکھنے کی فکر اور اللہ تعالیٰ کو راضی

کرنے کی ذرا فکر نہیں، خلق کی تو کچھ شرم بھی ہوتی ہے خالق کی ذرا شرم نہیں، سردی کا بندوبست سردی سے پہلے اور گرمی کا انتظام گرمی سے پہلے کرنے والے کو مابعد الموت کے لئے اپنی زندگی میں کوئی تیاری نہیں جبکہ سردی اور گرمی کا یہ حال یہ ہے کہ وہ اچانک نہیں آجاتی بلکہ تدریجاً آتی ہے، اور اس کے لئے وقت بھی مقرر ہے، اور موت اچانک اور دفعۃً آتی ہے، اس کا وقت کسی کو معلوم نہیں، لیکن تیاری اس کی زیادہ ہے اور اس کی کم، اور میں نے اس سے کہا کہ تم جب سردی کا بندوبست بقدر اس کے طول اور شدت کے کرتے ہو تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی بھی بس اتنی ہی کرو جس قدر تمہیں عذابِ دوزخ کا سہارا ہو اور آخرت کی تیاری اتنی زیادہ کرو جتنے دنوں تمہیں وہاں رہنا ہے، اُس نے کہا یہ تو آپ نے بہت معقول بات فرمائی، اس کے خلاف تو کوئی احمق ہی سوچ سکتا ہے، اور چند دنوں متاثر نظر آیا مگر دیکھا کہ پھر وہی لیل و نہار اور وہی غفلت کے مشاغل! پس اے محترم! میرا خود اپنا یہ حال ہے کہ بقول شخصے میرا نفس نصف حصہ تو اصلاح قبول کرتا ہے اور نصف مہمل ہی رہتا ہے، جب میں نے اپنا اور عام لوگوں کا یہ حال دیکھا کہ طغیانی اور سرکشی کا یہ عالم ہے کہ نہ قرآن سے ان کو نفع نہ موت کا خیال ان کی اصلاح کے لئے کافی تو میں مجبور ہوا کہ اس کا سبب معلوم کروں کہ آخر کون سی ایسی بیماری اس کو لگی ہے کہ کوئی دوا کارگر نہیں ہوتی اور عجیب لطف کی بات یہ ہے کہ بات مانتا ہے، قصور کا اس کو اعتراف بھی ہے، مگر حال ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد　　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی

بہرحال مَنْ جَدَّ وَجَدَ جو شخص کوشش کرتا ہے وہ مقصود کو پالیتا ہے، میں بھی اپنی تفتیش میں کامیاب ہو گیا اور ڈور کا سرا مجھے مل گیا، لہٰذا اب پہلے خود اپنے کو اور اس کے بعد آپ کو یہ وصیت کرتا ہوں کہ اس مرض سے خود بچانا اور خبردار خبردار اس کے پاس سے بھی ہو کر نہ گزرنا، یہ انتہائی مہلک بیماری ہے اسی سے انسان دھوکا کھاجاتا ہے

اور خسارہ اٹھاتا ہے، اور وہ بیماری ہے اپنی زندگی کو طویل سمجھنا اور یہ خیال کرنا کہ ابھی تو بہت عمر پڑی ہے، کرلیں گے نماز وروزہ، توبہ کا زمانہ تو بڑھاپے کا زمانہ ہوتا ہے، اور ع ابھی تو جوان ہوں۔ حالانکہ اگر کوئی صادق ومصدوق اس کو صبح یہ خبر دے کہ شام کو تو مر جائے گا، یا شام کو یہ کہے کہ تو صبح ہوتے ہوتے چل بسے گا تو اس کی پریشانی اور بیماری کا اندازہ کرو اور آخرت کی تیاری میں اس کی چستی اور مستعدی کو دیکھو، لہٰذا میں اب سمجھ کر اور بصیرت کے ساتھ خود اپنے کو، تم سب کو وہی وصیت کرتا ہوں جو کہ رسول اللہ ﷺ نے وصیت فرمائی تھی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے ہر شخص اپنی نماز ایسی پڑھے گویا یہ نماز اس کی آخری نماز ہے، ظاہر ہے کہ جب انسان اِس دُھن اور جذبہ کے ماتحت نماز یا کوئی بھی طاعت ادا کرے گا تو اسکی خوبی اور کمال کا پوچھنا ہی کیا؟ خشوع وخضوع اس کی طاعت کا زیور ہوگا، قلب سے خیالِ دنیا کافور ہوا ہوگا، اللہ کی رحمت پر اس کی نظر ہوگی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہی مرتبۂ عظمیٰ، درجۂ احسان ہمیں بھی نصیب فرمائے، اپنے میں اس کی بہت کمی دیکھتا ہوں، حاصل یہ کہ نصیحت اور وصیت تو بے شمار ہیں، اس وقت میں صرف اِسی ایک وصیت پر اکتفا کرتا ہوں، جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں بیان فرمایا ہے، فرماتے ہیں: **وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَإِيَّاكُمْ أَنِ اتَّقُوا اللهَ۔** پس کیا ہی سعید ہیں وہ لوگ جو اللہ کی نصیحت ووصیت کو دل کے کانوں سے سنیں۔ **يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔** (الروض الفائق، ص:۸)

◆ ◆ ◆ ◆ ◆

ضمیمہ (۷)

تقریر قُبیل نمازِ عیدالاضحیٰ (۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء)

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم :

قال اللہ تعالیٰ: رَبَّنَا إِنِّی أَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِی بِوَادٍ غَيْرِ ذِی زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَۃً مِنَ النَّاسِ تَهْوِیْ إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْکُرُوْنَ۔

حدیث شریف میں سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کا اپنی اولاد کو یہاں ٹھہرانے اور بسانے کا واقعہ مفصل مذکور ہے، علماء نے بھی حدیث اور تاریخ کی روشنی میں تفصیل سے اسے بیان فرمایا ہے۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی نے اپنی مستند کتاب تاریخ اسلام میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وطن بابل تھا، یہاں کا حاکم اللہ کا نافرمان نمرود تھا، اس نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنے دعویٔ ربوبیت کا مخالف پا کر دہکتی آگ میں ڈلوادیا تھا، لیکن وہ اللہ کے حکم ابراہیم علیہ السلام پر گلزار بن گئی تھی۔ **قُلْنَا يٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰی اِبْرَاهِيْمَ**، جب نمرود سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کو اپنا مطیع بنانے سے مایوس ہوگیا اور اسے اندیشہ ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا توحیدی وعظ دوسری رعایا پر اثر انداز ہوجائے گا تو اس نے آپ کو مع اہل خانہ کے جلاوطن ہوجانے کا حکم دیدیا، ادھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر (بت تراش) کو نہایت نرم اور محبت آمیز الفاظ میں توحید کی طرف بلایا، جس کا ذکر خود قرآن شریف میں یوں آیا ہے، سورۂ مریم میں ہے: **واذکر فی الکتاب ابراهیم إنه کان صدیقاً نبیاً** سے **قال أراغبٌ أنت عن اٰلهتی یاابراهیم لئن**

تنته لارجمنک واهجرنی ملیاً تک (آیت:۴۱تا۴۶)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب باپ کی جانب سے بھی ایسا سخت جواب سنا کہ اگر تم نے بتوں کو نہ مانا اور ان کو برا بھلا کہنا نہ ترک کیا تو میں تمہیں سنگسار کردوں گا، اور ہمیشہ ہمیش کے لئے تم سے ترک تعلق کرلوں گا، اور جاؤ تم ہمارے یہاں سے چلے جاؤ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے دین کے تحفظ کی خاطر کسی ایسے مقام کی تلاش ہوئی جہاں امن واطمینان کے ساتھ وہ اپنے رب کی عبادت کرسکیں، اس مقصد کے پیش نظر آپ نے اپنی بیوی حضرت سارہ اور اپنے بھتیجے حضرت لوطؑ کو ہمراہ لے کر نہایت خوشی کے ساتھ اللہ کے بھروسے پر فوراً اٹھ کھڑے ہوئے، اور دار الکفر سے ہجرت کر کے مصر پہونچے۔ فرعون مصر جو انتہائی بداخلاق اور شہوت پرست تھا اس نے بی بی سارہ کے حسن وجمال کی شہرت سنی تو اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس کہلا بھیجا کہ اگر زندگی چاہتے ہو تو سارہ کو بنا سنوار کر ہمارے حضور میں حاضر کرو، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس پر تشویش تو ہوئی، لیکن مجبور ہو کر سارہ فرعون کی جانب روانہ کردیا، اور بارگاہِ الٰہی میں دست بدعا ہوئے کہ بارِ الٰہا! غریب اور بیکس بندوں کی آبرو تیرے ہاتھ میں ہے، اس انابت اور دعا کا یہ اثر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سارہ کو اس کے دست برد سے محفوظ رکھا، اور وہ بالکل صحیح وسالم خوش وخرم گھر واپس آگئیں، مزید یہ کہ ان کی حیرت انگیز کرامت کو دیکھ کر فرعون مصر نے اپنی ایک مخصوص اور نہایت ہی خوبصورت باندی حضرت ہاجرہ کو انھیں دے کر رخصت کیا، انھوں نے اس خیال سے کہ مجھ سے اب تک کوئی اولاد نہیں ہوئی ہے یہ باندی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہبہ کردیا، چنانچہ آپ کے ہی بطن سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے صاحبزادے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پیدا ہوئے، اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد حضرت سارہ کا منشاء اور خدا کا حکم پا کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انھیں اس وادی غیر زرع پر لا چھوڑا جسے آج مکہ کہا جاتا ہے۔ ☆☆☆

ضمیمہ (۸)

مسلم لڑکیاں اور موجودہ تعلیم دنیوی

(ماخوذ از اخبار ''دست بدست'' مراد آباد، مجریہ یکم مارچ ۱۹۸۳ء)

تجربہ بتلاتا ہے کہ انگریزی تعلیم اور کالج کے ماحول سے اسلامی عقائد اور اخلاق و عادات بگڑ جاتے ہیں، بقول اکبر الہ آبادی مرحوم ؎

نظر ان کی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر
گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

حضرت شیخ الہندؒ کا ارشاد ہے کہ اگر انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگ جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب والوں کا مذاق اُڑائیں یا حکومت وقت کی پرستش کرنے لگیں، تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کیلئے جاہل ہی رہنا بہتر ہے۔ (خطبۂ صدارت جلسہ علی گڈھ یونیورسٹی ۱۹۲۰ء)

حکیم الامۃ حضرت مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں کہ آج کل تعلیم جدید کے متعلق علماء پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ تعلیم جدید سے روکتے ہیں اور اس کو ناجائز بتلاتے ہیں، حالانکہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر تعلیم جدید کے یہ آثار نہ ہوتے جو علی العموم اس پر اس وقت مرتب ہو رہے ہیں تو علماء اس سے ہرگز منع نہ کرتے، لیکن اب دیکھ لیجئے کہ کیا حالت ہو رہی ہے، جس قدر جدید تعلیمیافتہ ہیں باستثناء شاذ و نادر ان کو نماز سے غرض ہے، نہ روزے سے، نہ شریعت کے کسی دوسرے حکم سے سے، بلکہ ہر بات میں شریعت کے خلاف ہی چلتے ہیں، اور پھر کہتے ہیں اس سے اسلام کو ترقی ہوتی ہے۔ (فضل العلم والعمل، ص: ۸)

اور فرماتے ہیں کہ مدارس اسلامیہ میں بے کار ہوکر رہنا لاکھوں کروڑوں درجے انگریزی میں مشغول ہونے سے بہتر ہے، اس لئے کہ گو لیاقت اور کمال نہ ہو لیکن کم از کم عقائد تو فاسد نہ ہوں گے، اہل علم سے صحبت تو ہوگی اگر کسی مسجد کی جاروب کشی ہی میسر ہو، یہ جاروب کشی اس انگریزی میں کمال حاصل کرنے اور وکیل و بیرسٹر بننے سے کہ جس سے اپنے عقائد فاسد ہوں اور ایمان میں تزلزل ہو، اور اللہ اور رسول اور صحابہ اور بزرگانِ دین کی شان میں بے ادبی ہو کہ جو اس زمانہ میں انگریزی کا اکثری بلکہ لازمی نتیجہ ہے اور یہ ترجیح تو ایک محبّ دین کے نزدیک بالکل واضح ہے، ہاں جس کو دین کے جاننے کا غم ہی نہیں وہ جو چاہے کہے۔ (حقوق العلم، ص: ۶۲ و ۶۴)

ڈاکٹر ہنٹر کا قول ہے کہ ہمارے انگریزی اسکولوں میں پڑھا ہوا کوئی نوجوان ہندو یا مسلمان ایسا نہیں جس نے اپنے بزرگوں کے مذہبی عقائد کو غلط سمجھنا نہ سیکھا ہو۔ (مسلمانانِ ہند، ص: ۱۴۲) مسٹر گاندھی لکھتے ہیں کہ ان کالجوں کی اعلیٰ تعلیم بہت اچھے صاف اور شفاف دودھ کی طرح ہے جس میں تھوڑا سا زہر ملا دیا گیا ہو۔

(خطبۂ صدارت حضرت شیخ الہندؒ علی گڈھ یونیورسٹی ۱۹۲۰ء)

سر سیّد مرحوم لکھتے ہیں کہ اِسی طرح لڑکیوں کے اسکول بھی قائم کئے گئے جن کے ناگوار طرز نے یقین دلا دیا کہ عورتوں کو بدچلن اور بے پردہ کرنے کے لئے یہ طریقہ نکالا گیا۔ (اسباب بغاوتِ ہند)

مسٹر فضل حق وزیر بنگال نے ۱۹۳۸ء میں پٹنہ کے ایک جلاس کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا کہ جس قسم کی تعلیم کالج اور اسکولوں میں ان کو دی گئی دراصل اس نے ان کو نہ دنیا کا چھوڑا نہ دین کا، اگر ایک مسلمان بچے نے اونچی سے اونچی تعلیم کی ڈگری حاصل کر لی بھی لیکن اس کوشش میں مذہب کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تو اس کا ڈگریاں حاصل کرنا قوم کے لئے کیا مفید ہو سکتا ہے، مفید اس وقت ہو سکتا ہے جب مسلمان رہ کر قوم ترقی کرے۔ بقول اکبر الہ آبادی ؎

فلسفی کہتا ہے کیا پرواہ ہے گر مذہب گیا
میں یہ کہتا ہوں کہ بھائی یہ گیا تو سب گیا

(اخبارِ مدینہ بجنور، ۹/ اکتوبر ۱۹۳۸ء)

ایسی تعلیم دلانا جس سے دین وایمان پر اثر پڑتا ہو، جو غیر اسلامی کلچر، غیر اسلامی اخلاق وعادات اختیار کرنے کا ذریعہ بنتی ہو، ہر ایک کے لئے ناجائز ہے لڑکی ہو یا لڑکا، البتہ یہ فرق کیا جاسکتا ہے کہ چونکہ لڑکیوں کی فطرت اثرِ بد کو جلد قبول کرلیتی ہے اور مذہبی لحاظ سے معاشی ذمہ داریاں بھی ان پر نہیں ہوتیں تو ان کو انگریزی تعلیم سے علیٰحدہ رہنا چاہئے، اور انھیں انگریزی اسکول اور کالجوں کی ہوا بھی نہیں لگنی چاہئے، اگر لڑکے مذہبی بنیادی ضروری تعلیم حاصل کرلیں اور اسلامی تمدن، اسلامی اخلاق اور عادات پر بھی مضبوطی سے قائم رہیں تو بے شک ان کے لئے گنجائش ہے کہ وہ جتنی چاہیں انگریزی کی ڈگریاں حاصل کرلیں، بقول اکبرالہ آبادی مرحوم ؎

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو — جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھولو
بس ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد — اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

مگر موجودہ دور میں یہ گارنٹی بالکل ناممکن معلوم ہوتی ہے، پس اسلامی عقائد اور اسلامی اخلاق وغیرہ پر مضبوطی سے قائم رہنے کا یقین نہ ہو اور اثرِ بد اور برے ماحول سے محفوظ رہنے کا بھی پورا اطمینان نہ ہو تو جس طرح مہلک مرض اور مفسد صحت آب وہوا سے اولاد کی حفاظت کرنا ضروری ہے، اولاد کی خیر خواہی اسی میں ہے کہ ان کے دین کی درستگی کی فکر دنیا کی درستگی کی فکر سے زیادہ ہو۔ (مجالس الابرار، ص: ۵۰۰)

بزرگانِ دین فرماتے ہیں کہ آدمی کا دوست وہ ہے جو اس کی آخرت کی درستگی کی کوشش کرے اگرچہ اس میں اس کی دنیا کا کچھ نقصان ہو، اور اس کا دشمن وہ ہے جو اس کی آخرت کے نقصان میں کوشش کرے اگرچہ اس میں اس کی دنیا کا فائدہ ہو۔

ایک لائق مطالعہ کتاب

حیاتِ مصلح الامت

مولف: مولانا اعجاز احمد اعظمی

صفحات: 528 قیمت: 150

صاحب تذکرہ حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب جامؔی کے شیخ ومرشد، اپنے وقت کے عظیم مصلح اور مربی، داعی الی اللہ مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مفصل ومستند سوانح حیات! اس کتاب کے متعلق مفکر اسلام حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ رقم طراز ہیں:

> ’’ مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی کی تالیف کی ہوئی کتاب ’’حیاتِ مصلح الامت‘‘ کا کتابت شدہ مسودہ طباعت کے لئے تیار ہے، میں نے جستہ جستہ اس پر نظر ڈالی اور اس کے بعض حصے سنے، کتاب جدید اسلوب اور مذاق کے مطابق لکھی گئی ہے، اور اس میں جہاں تک مجھے اندازہ ہوا وہ خصوصیات موجود ہیں جن کی طرف میں نے اشارہ کیا۔ میرا مصنف سے اس کتاب کے ذریعہ پہلی مرتبہ تعارف ہوا، وہ مدرسۂ دینیہ غازی پور کے مدرس ہیں، جن کا اصلاً اشتغال درس وتدریس سے ہوگا، لیکن ان میں تصنیفی سلیقہ، تحریر میں ایسی شگفتگی اور سلاست، کتاب میں ایسی حسن ترتیب اور مضامین کا حسن انتخاب ہے جو کہنہ مشق مصنفوں اور اہل قلم میں پایا جاتا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت وقت کی ایک اہم دینی واصلاحی خدمت اور بزرگوں کی سوانح عمریوں میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔‘‘ (حیات مصلح الامت، ص: ۱۶)

تصانیف حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی علیہ الرحمہ

(۱) **تسہیل الجلالین** ''شرح اردو جلالین شریف'' (جلد اول)

(سورہ بقرہ تا سورہ نساء، سوا پانچ پارے)، صفحات:648 قیمت:400

(۲) **حدیث دوستاں**

دینی و اصلاحی اور علمی و ادبی مکاتیب کا مجموعہ، صفحات:730 قیمت:350

(۳) **حدیث دردِ دل**

مجلّہ المآثر، الاسلام، اور ضیاء الاسلام کے اداریئے صفحات:592 قیمت:300

(۴) **کھوئے ہوؤں کی جستجو**

مختلف شخصیات پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ، صفحات:616 قیمت:200

(۵) **حیاتِ مصلح الامت**

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب اعظمی کی مفصل سوانح، صفحات:528 قیمت:150

(۶) **مدارسِ اسلامیہ، مشورے اور گزارشیں** (جدید اضافہ شدہ ایڈیشن)

مدارس سے متعلق مضامین کا مجموعہ، صفحات:312 قیمت:150

(۷) **بطوافِ کعبہ رفتم** ---(سفرنامۂ حج) (جدید اضافہ شدہ ایڈیشن)

حرمین شریفین (مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ) کے سفر کی روداد، صفحات:464 قیمت:300

(۸) **تہجد گزار بندے** (جدید اضافہ شدہ ایڈیشن)

تہجد کی اہمیت و فضیلت اور تہجد گزار بندوں کا تفصیلی تذکرہ، صفحات:472 قیمت 300

(۹) ذکرِ جامی

ترجمان مصلح الامتؒ مولانا عبدالرحمٰن جامی کے حالاتِ زندگی، صفحات:216 قیمت:90

(۱۰) حضرت چاندشاہ صاحب اوران کا خانوادۂ تصوف

حضرت چاندشاہ صاحب ٹانڈوی اوران کے خلفاء کے حالات، صفحات:180 قیمت:70

(۱۱) **تذکرہ شیخ ہالیجویؒ**: سندھ کے معروف شیخ طریقت وعالم اورمجاہد فی سبیل اللہ

حضرت مولانا حماداللہ صاحب ہالیجوی کا مفصل تذکرہ۔ صفحات:224، قیمت:56

(۱۲) مودودی صاحب اپنے افکارونظریات کے آئینہ میں

مولانا بنوریؒ کی عربی کتاب الاستاذ المودودی کا ترجمہ۔ صفحات:184، قیمت:95

(۱۳) **حکایت ہستی** (جدید اضافہ شدہ ایڈیشن)

خودنوشت سوانح، ابتداء حیات سے اختتام طالب علمی تک۔ صفحات:400، قیمت:250

(۱۴) **کثرتِ عبادت** عزیمت یا بدعت؟ قیمت ۲۸/روپۓ

(۱۵) **قتل ناحق** قرآن وحدیث کی روشنی میں قیمت ۱۶/روپۓ

(۱۶) تعویذات وعملیات کی حقیقت وشرعی حیثیت قیمت ۲۰/روپۓ

(۱۷) شب برأت کی شرعی حیثیت قیمت ۴۰/روپۓ

(۱۸) اخلاق العلماء علماء کیلئے خاص چیز قیمت ۲۰/روپۓ

(۱۹) دینداری کے دو دشمن حرصِ مال وحب جاہ قیمت ۴۰/روپۓ

(۲۰) فتنوں کی طغیانی ٹی۔وی پرایک فکرانگیز تحریر! قیمت ۱۵/روپۓ

(۲۱) اہل حق اوراہل باطل کی شناخت قیمت ۶۰/روپۓ

(۲۲) مالی معاملات کی کمزوریاں اورانکی اصلاح قیمت ۴۰/روپۓ

(۲۳) منصب تدریس اور حضرات مدرسین	قیمت ۴۵/روپئے
(۲۴) حج وعمرہ کے بعض مسائل میں غلو اور اس کی اصلاح	قیمت ۳۵/روپئے
(۲۵) برکات زمزم ماءزمزم کی فضیلت واہمیت کا بیان	قیمت ۲۵/روپئے
(۲۶) تصوف ایک تعارف!	قیمت ۸۰/روپئے
(۲۷) خواب کی شرعی حیثیت	قیمت ۴۰/روپئے
(۲۸) تکبر اور اس کا انجام	قیمت ۳۰/روپئے
(۲۹) مسئلۂ ایصالِ ثواب	قیمت ۶۰/روپئے
(۳۰) مروجہ جلسے بے اعتدالیاں اور ان کی اصلاح	قیمت ۳۰/روپئے
(۳۱) رمضان المبارک: نیکیوں کا موسم بہار	قیمت ۴۰/روپئے
(۳۲) علوم ونکات: (مجموعۂ مضامین) جلد اوّل، دوم	قیمت ۱۰۰۰/روپئے
(۳۳) نمونے کے انسان	قیمت ۲۵۰/روپئے

اسٹاکسٹ

مکتبہ ضیاء الکتب اترا ری، خیر آباد، ضلع مئو (یوپی)
PIN:276403 MOB:9235327576

دیوبند میں ہماری کتابیں ملنے کا پتہ
کتب **خانہ نعیمیہ**، جامع مسجد دیوبند (01336223294)

دہلی میں ہماری کتابیں ملنے کا پتہ
فرید بک ڈپو، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ (01123289786)